ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
راجندر سنگھ بیدی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

راجندر سنگھ بیدی

سنہ ۱۹۸۸ء

مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ

فہرست

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ایک اعتراف

پادری روزاریو نے گناہ گار جاہن سے کہا ”تم تو اعترافِ گناہ کے لیے میرے پاس آئے تھے، مگر تم نے آکر ڈینگیں مارنا شروع کر دیں۔۔۔“

مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے ایک دن مجھے گناہ گار کی صورت میں کھڑا ہونا پڑے گا اور اپنے وہ گناہ قبول کرنے پڑیں گے جو میں

نے نہیں کیے۔ یا اگر کیے ہیں تو اس لیے کہ مجھے فن کی سند حاصل ہے، جو ایک طرح سے راشٹر پتی کی معافی ہے جو سنگین سے سنگین قتل میں بھی سرکاری گواہ کو میسّر ہوتی ہے۔۔۔۔

باپ روزاریو! میں ایک سیدھا سادہ، حلالی اور قانون پرست شہری تھا۔ اپنے پڑھنے والوں سے پیار، ان سے لاڈ کرتا تھا، انہیں چومتا چاٹتا تھا حالانکہ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ میں سب کو سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا اور اگر کہیں ان کو پیرِ تسمہ پا کی طرح اپنے اوپر سوار ہوتے دیکھتا تو جھٹک بھی دیتا۔ میں ایک طرح کا جمینز (Jimenez) تھا جو اپنا دُکھ سکھ اپنے پلاٹیرو (Platero) کو بتاتا ہے، جو ایک بڑا پیارا اور معصوم سا گدھا ہے اور جمینز کی بدولت اب تک کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ اس گدھے کو نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں کیونکہ اپنی خدمات کے عوض وہ جمینز کو نوبل پرائز بھی دلوا چکا ہے۔۔۔۔

گدھے کے ذکر کا برا مت مانئے فادر روزاریو! آپ تو جانتے ہیں کہ مغرب میں گدھے کو اتنا برا جانور نہیں سمجھا جاتا جتنا کہ ہم اپنے ہاں سمجھتے ہیں۔ پھر آپ تو گوا کے رہنے والے ہیں اور اب ہندوستانی ہو گئے ہیں۔ آپ ہی بتایئے گدھے کی بے

وقوفی ایک اسطوری بات Myth نہیں جو ہم اور آپ ہی نے مل کر بنائی ہے؟ گدھے میں کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ۔۔۔۔۔ وہ بوجھ اٹھاتا ہے۔ ڈنڈا کھانے پر فقط رفتار کو تھوڑا تیز کر دیتا ہے مگر شکایت کا حرف تک زبان پر نہیں لاتا۔ جو ایک کامیاب زندگی کا راز ہے اور جس کی تلقین ہمارے روحانی پیشوا کب سے کرتے آئے ہیں اور ہمارے نیتا اب تک کرتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے، باپ روزاریو! کیا میری بوجھل تحریر پڑھ کر میرے قاری مجھے مارنے دوڑتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ ایسا ہوتا تو میں روز صبح ان کو ماٹنگا میں پان والے کی دکان اور دن کو کسی فلم اسٹوڈیو میں مل جاتا اور شام کو کہیں ہسپتال میں اپنی پسلیاں گنتا۔ وہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ مجھے سمجھ گئے ہیں اور میں ان کا راز پا گیا ہوں۔ قصّہ مختصر انہیں مجھے اور مجھے انہیں بے وقوف سمجھنے کی پوری آزادی تھی، جو اب ان حالات میں نہیں ہے جبکہ میں جاہن۔۔۔ گناہِ اقبال۔۔۔ معاف کیجیے۔۔۔ اقبالِ گناہ کے لیے آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور سر جیسے گوپھٹے میں پڑا ہے۔ اگر میں بے باک طریقے سے اعترافِ گناہ کرتا ہوں تو آپ کو وہ میری ڈینگیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور اگر دبی زبان

سے مانتا ہوں تو حقیقت مونالزا کی مبہم سی مسکراہٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔۔۔ عجب مصیبت ہے نا؟

فادر روزاریو! اعترافِ گناہ کا مسئلہ میرے نزدیک بہت نازک ہے۔ میں ایک ایماندار آدمی ہوں اس لیے جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ چاہے خدا حاضر وناظر ہو یا نہ ہو۔ میرا ہاتھ مقدس کتاب پر ہو یا نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہ لیجئے گا کہ میں خدا کو نہیں مانتا یا کسی مقدس کتاب پر ایمان نہیں لاتا۔ خدا پر ایمان نہ لانا تو اپنے آپ پر ایمان نہ لانے کے برابر ہے۔ فادر! کیونکہ ہمارا اپنا "آپ" ہی خدا ہے۔ اور کتاب بھی میری ہی طرح کے ایک انسان نے اپنے ارفع لمحوں میں لکھی ہے۔ میں ایسا ہی کافر ہوتا تو اس اعتراف کے سلسلے میں آپ جو خدا کے نمائندے ہیں کے پاس ہی کیوں آتا؟ آپ بے صبر ہو رہے ہیں؟۔۔ یہ توڈینگ نہیں ہے۔ بہر کیف میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گناہ پہلے ہوتا ہے اور اعتراف بعد میں۔ لیکن اپنا کیا کروں؟ میں ان گناہ گاروں کی قبیل میں سے ہوں جو اعتراف پہلے کرتے ہیں اور جب کوئی ان کے اعتراف کو اہمیت نہ دے یا اُن کی طرف دیکھتا نہ ہو تو چپکے سے ایک طرف جا کر کہانی لکھ مارتے ہیں۔

پہلے میں اپنی کہانی کے کرداروں اور اس کے تانے بانے کو اپنے دوستوں پر آزماتا ہوں، باپ روزاریو! مگر ساتھ ہی یہ صریح جھوٹ بول دیتا ہوں کہ میں اسے لکھ بھی چکا ہوں۔ اس جھوٹ کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی حرام الدّہر اسے چُرا نہیں سکتا، اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنی کہانی کے اثر کا پتا چل جاتا ہے۔ اگر وہ بہت ہی متاثر معلوم ہوں اور خوب ہی سر دھنیں تو میں اس کہانی کو سرے سے لکھتا ہی نہیں۔ ہاں ایسی کہانی لکھنے کا فائدہ ہی کیا فادر، جسے چھوٹتے ہی ہر نتھو خیرا سمجھ جائے! اگر ان کے چہروں پر ناسمجھی کے نقوش دیکھتا ہوں تو مجھے یقین آ جاتا ہے کہ میاں اب بات بنی۔ جب میں اسی وقت لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ کہانی ہوتی بھی بے حد کامیاب ہے، کیونکہ وہ میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی جو کہ میرے نزدیک فن کی معراج ہے۔ دیکھیے تو دنیا بھر کا آرٹ کیا ناول اور کیا مصوّری اور کیا تعمیر، سب کدھر جارہے ہیں؟ اور ہم ابھی تک مطلب کے چکر میں پڑے ہیں۔ میں مطلب کی پرواہی نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہوں تو بہت بعد میں۔ میں لوگوں کو کہانی کے بارے میں لے دے کرنے دیتا ہوں۔ ناسمجھی کے الزام سے ڈرتے ہوئے وہ خود ہی اس میں معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو

جاتے ہیں۔ جب میں بے اختیار ان کی داد دیتا ہوں اور ان کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہہ اٹھتا ہوں۔ بالکل میرا بھی یہی مطلب تھا۔ مگر افسوس ذہانت کے اس ویران آباد ملک ہندوستان میں سمجھنے والے کتنے لوگ ہیں؟ دراصل کہانی ہر ایک کے لیے لکھی بھی نہیں جاتی فادر! میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک آدمی بھی سمجھ گیا تو میری محنت ٹھکانے لگی۔۔۔ جیو۔۔۔۔

کیا میں پھر ڈینگیں مار رہا ہوں، فادر؟

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اعتراف پہلے کرتا ہوں اور گناہ بعد میں۔ اعتراف پہلے ہو یا گناہ لیکن ایک بات طے ہے کہ اعتراف و گناہ دونوں الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بیکار ہی آپس میں الجھتے رہتے ہیں۔ میں انہیں علیحدہ علیحدہ لے جا کر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن دونوں برابر اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی ہی ایک کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک آدمی کسی مرد عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ کیا مرد اور عورت کے جھگڑے کا کوئی حل ہے، باپ روزاریو؟ کبھی ہوا ہے یا ہو گا؟ ایک مارنے والا اور دوسرا مار کھانے والا۔ ایک اذیّت دینے والا اور دوسرا اذیّت سہنے والا۔ اور دونوں اسی طرح سے خوش

ہوتے رہتے ہیں ہم بیچ میں ماموں ہوتے ہیں؟ البتّہ مرد اور عورت کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اپنا رول بدل بھی لیتے ہیں، کیونکہ ہر مرد میں ایک عورت چھپی ہوتی ہے اور ہر عورت میں کئی مرد۔ کم از کم بھرتری ہری تو اپنے شر نگار شک میں کچھ ایسا ہی لکھتے ہیں۔۔۔

بہر حال ان کے فضیحتے کے بارے میں ازل سے کہانیاں لکھی جارہی ہیں اور ابد تک لکھی جائیں گی، جن میں جھگڑا مار پیٹ، ایذا رسانی ایک ضمنی اور مقامی حیثیت رکھیں گے اور ہم تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کی ساری رہبانیت اور اپنے تجرد کے فلسفے میں ہم اسی بات کو تسلیم نہیں کرتے جس کی نفی میں ہم اپنے بدن کے پچھواڑے کو برفاب میں ڈبوتے، درختوں پر الٹا لٹکتے اور اذیت دینے والے فاقے کرتے ہیں؟ بوکاشیو کی داستانوں میں کتنے مردوں اور کتنی عورتوں نے اعترافِ گناہ کیا اور پھر اپنی پہلی ہی فرصت میں گناہ کی طرف لوٹ آئے کیونکہ وہ سانپ کی کھال کی طرح سے ڈراؤنا ہوتا ہے اور خوبصورت بھی۔ درمیان میں کوئی ایبٹ اور فرائر جو خود کو خدا اور کلیسا کا نمائندہ کہتا تھا بے وقوف بن گیا۔ کیا وقت نہیں آیا فادر کہ

ایبٹ اور فرائر مُلّا اور قاضی، پنڈت اور پجاری لوگ بے وقوف بننا چھوڑ دیں؟ میری بات چھوڑیے۔ میں اس وقت سچّے دل سے اعتراف کر رہا ہوں اور بہت سے لوگوں کی طرح کنفیشن کے کان کاٹ کر اسے فیشن کے طور پر استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ ہاں بعد میں کیا ہوتا ہے، یہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ سوائے اس حسین ابہام کے جو ہمارا خدا ہے اور کون جان سکتا ہے۔۔۔۔؟ تو میں کہہ رہا تھا کہ میری کہانی میں وہ آدمی مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ جس طریقے سے میں اعتراف اور گناہ کو الگ الگ اور منفرد حیثیت دیتا ہوں، اسی طرح اس نے دونوں کو الگ الگ سمجھانے کی کوشش کی۔ پہلے وہ مرد کو ایک طرف لے گیا اور بڑے جوکھم کے ساتھ اسے سمجھایا بجھایا اور اس کے خون آشام غصّے کو ٹھنڈا کیا، پھر وہ عورت کو الگ ایک طرف لے گیا مگر آج تک واپس ہی نہیں آیا۔۔۔

ہیں، فادر روزاریو؟!!

میرے لکھنے لکھانے کی ابتدا چوری سے ہوئی، باپ روزاریو! آپ گھبرایئے نہیں۔ ذرا صبر سے میری بات سنیے، میں کہیں بھی اس چوری کے سلسلے میں اپنے آپ کو حق بجانب نہیں ٹھہراؤں گا۔ آپ کے اٹھے ہوئے ابرو اور چہرے کے

سوالیہ نشان مجھے پریشان کر رہے ہیں، اس لیے بعد کی بات پہلے ہی کیوں نہ کہہ دوں تاکہ آپ کو اپنے وجود سے بھی تسلّی رہے۔ میں نے چوری کی اور پھر خود ہی اپنے منہ پر دو تین چپتیں بھی ماریں۔ کیونکہ اِس کام کے لیے اور کوئی پاس نہیں تھا۔ جیسا کہ ہر کامیاب چوری میں وہ نہیں ہوتا۔ نہ معلوم کہاں چلا جاتا ہے؟ ایک طرح سے اچھا ہوا کیونکہ کئی لوگوں میں صبر نہیں ہوتا، اِدھر چوری ہوتی ہے، اُدھر وہ چلّانا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے دور بھاگتے ہیں، اور جب دوسرے مدد کے لیے آجائیں تو پھر قریب آجاتے ہیں۔ اور پکڑ لیتے ہیں۔ آپ چاہے کتنی بھی معافی مانگیں مگر وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی سرشت میں کتنا ظلم، کتنی ناانصافی ہے کہ چوری بھی آپ ہی کو کرنی پڑے اور معافی بھی آپ ہی مانگیں۔۔۔۔

قصّہ یوں ہوا فادر، کہ ہمارے کالج کے ایک پروفیسر اکولا میں کہیں سب جج ہو گئے۔ کامیابی کا دروازہ ان پر کسی پاگل سے قہقہے کی طرح سے کھُل گیا۔ اب ان کی سمجھ میں آرہا تھا کہ کیا کریں؟ چنانچہ ہم لڑکوں کو جو بکھرے ہوئے تھے، اکٹھا کیا اور ایک لیکچر دینا شروع کر دیا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا، باپ روزاریو! کہ کامیابی کے دروازے پر کھڑا آدمی اندر کیوں نہیں جاتا؟ باہر ہی لیکچر

دینا کیوں شروع کر دیتا ہے؟ شاید اس لیے کہ اندر جاتے ہی اسے کامیابی کی اساس کا پتہ چل جاتا ہے۔ پھر دوسرے لیکچر دیتے ہیں اور وہ غریب کان بند کرنے کی کوشش میں منہ کھول کر سُنتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے کہا۔ ''اس دنیا میں معمولی Mediocre قسم کے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تم چاہے چور بنو لیکن اس پائے کے چور کہ دنیا بھر میں کوئی دوسرا تمہاری ہمسری نہ کر سکے۔''

اب اس عمر میں ہمیں کیا معلوم فادر روزاریو؟ ہمارے نزدیک تو چور کا ایک لفظ تھا۔ جو کل روئے زمین پر گھوم کر پھر ہمارے کانوں میں چلا آتا تھا۔ ایک بچّہ کیا جان پائے کہ پروفیسر کی زبان میں وہ ایک اصطلاحی لفظ تھا جس کا مطلب پردھان منتری بھی ہو سکتا ہے، انجنیئر ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔ ہم اس نئ تعلیم کو پروفیسر صاحب ہی سے شروع کرتے لیکن وہ تین ڈاؤن کلکتہ میل سے جا چکے تھے۔ ہمیں خاص بننے کا سبق دیتے ہی وہ خود ہمیشہ کے لیے عام ہو گئے تھے۔ پھر ہم نو آموزد کے سامنے کوئی ایسی زندہ مثال بھی تو نہ تھی۔ ہندوستان کے بھپوٹ اور امریکہ کے ال کپیون جن کی زمانے بھرنے عزّت کی ہے۔ عرشۂ

تاریخ پر بہت لیٹ آئے تھے۔

نوجوان ہونے کی وجہ سے مجھ میں بلا کا جوش تھا، فادر، جو کسی صبر کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ میں تو راتوں رات کسبِ کمال کرنا اور اپنا گھوڑا وہاں اوپر کہکشاں پر دوڑانا چاہتا تھا لیکن میرے پاس باگ کے پیسے تھے اور نہ رکاب کے دام۔ غالباً اسی لیے میں نے اُسے پو یہ ہی چلنے دیا۔ میں نے چھوٹتے ہی چوری نہیں کی، باپ روزاریو! میں جانتا تھی کہ قید ہو جانا بُرا سا لگتا ہے۔ پروفیسر صاحب سے کہیں پہلے ماں باپ مجھے لمبے چوڑے لیکچر دے چکے تھے اور پیٹ بھی چکے تھے۔ لیکن پروفیسر زیادہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس لیے اس کی بات دل کو لگتی تھی۔ چنانچہ دنیا کے ہر چور کی طرح، سرسری طور پر اپنے ضمیر کی تسلّی کے لیے میں نے پہلے شرافت کے سب گُر استعمال کیے۔ میری آواز اچھی تھی۔ اس لیے میں سنگیت سیکھنے کی غرض سے راوی روڈ لاہور کے گاندھرو دیالیہ کی سب سے آخری بٹالین میں بھرتی ہو گیا لیکن میرا جذبہ تھا کہ سات سُروں کی قید میں نہ آتا تھا اور آٹھویں کی اجازت نہ تھی۔ میرا گانا نوٹیشن میں آکر گانا، گانا پڑھا جاتا تھا۔ میں نے ایک دو تمغے مارے لیکن استاد بوٹے خاں مچھی ہٹہ والے اور امرت سر کے

چوئتھ رام کی مجلسوں میں جاتے ہی پتہ چل گیا کہ میرے سامنے تو برسوں کی ریاض کی دیوار کھڑی ہے اور آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ اور نوکِ زبان سے اسے ہموار کرنا ہو گا۔ چنانچہ میں یوں الگ ہو گیا جیسا کہ کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا ہوا آدمی فوراً اُٹھ کر تھوڑا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر اپنی پگڑی سنبھالتا، منہ میں کچھ منمناتا ہوا، اس منظر سے مل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ انٹی امپیئر لسٹ "جنگ" کا زمانہ تھا جس میں ہمارے لیڈر ہمیں سوت کے گولوں سے لڑنے کا مشورہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مار کھا کھا کر انگریز کو سور بنا دو۔ مار ہی کھانا ہوتی فادر تو میں شروع ہی سے پروفیسر کی بات پر عمل کیوں نہ کرتا؟ جب بم پٹاخا قسم کے لیڈر کی نوکری خالی تھی کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر میں نے ایک کھنڈر میں بم بنانے کی کوشش کی۔ انگریز گورنر مونٹ مورنسی تو جوں کا توں سلامت رہا لیکن میرے ایک ساتھی کا ہاتھ اُڑ گیا۔ وہ میرا ہاتھ بھی ہو سکتا تھا باپ روزاریو، جس سے بعد میں مَیں نے کہانیاں لکھیں اور اب اسے آپ کے ہاتھ پر رکھے ہوئے اِن گناہوں کا اعتراف کر رہا ہوں۔

چوری کی بات میں لٹکا نہیں رہا، باپ روزاریو، میں کہانی لکھنے والا ہوں اس لیے

اسے عین موقع پر فنّی انداز میں کہوں گا۔ یعنی اس وقت جب کہ آپ کا تحیّر پانی نہ مانگے۔ میں نے اور بھی بہت سے پاپڑ بیلے، پاپڑوں میں دال کے ساتھ کالی مرچ بھی پڑتی ہے۔۔۔ لیکن مجھے اب تک صرف آٹے دال ہی کا بھاؤ معلوم ہوا تھا۔ میں نے فنِ مصوّری میں نکل جانے کی کوشش کی اور میں واقعی نکل بھی گیا۔ ہوا یہ کہ لینڈ اسکیپ بنانے کی بجائے میں انسانی پیکر پر ہاتھ صاف کرنے لگا اور غلطی سے وہ بھی عورت کے پیکر پر۔ اسے بنانے میں میں خود ہی اس پر عاشق ہو گیا۔ اتنے مہنگے آرٹ پیپر کو ایک طرف چھوڑ کر میں زندگی میں اسے ڈھونڈنے کے لیے چل نکلا۔ جس کاغذ پر میں نے اسے بنایا تھا وہ تو اب تک گلایا، کوٹا اور پھر سے کاغذ بنایا جا چکا ہے۔ لیکن میں اب تک اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں نے بدن پر کے اس خط کی تحقیق شروع کر دی جو عورت کو مرد سے ممیز کرتا ہے۔ اور اس کے دماغ میں بے پناہ فتور پیدا کر دیتا ہے۔ دیکھیے نا ایک معمولی خم سے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر عورت کے بدن میں کمر سے نیچے رانوں کی طرف جو خط جاتا ہے وہاں ایک ہلکا سا بے بضاعت گڑھا پڑ جاتا ہے، جسے انسانی جسم کے تشریحی علم والے صرف رگوں اور پٹھوں کا اُتار چڑھاؤ سمجھتے ہیں۔ نا معلوم کیسے گویاؔ نے اپنی

مشہور پینٹنگ "ماجادی نیودا" میں اسے نظر انداز کر دیا؟ حالانکہ میں اس کے بارے میں کیا کچھ لکھ سکتا ہوں۔ دراصل اس قسم کی باتیں ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایک نے لکھا ہے کہ وہ سامنے کا کھیت جس کے پیچھے سورج غروب ہوتا ہے بسٹرلاک کا ہے لیکن نہیں وہ دراصل شاعر کی ملکیت ہے۔۔۔۔

میں شاعر ہو گیا۔ انگریزی کے ہیروئیک میٹر میں نظمیں لکھیں، جو چھپیں بھی۔ لیکن چھپنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارے کئی شاعر دوستوں کی نظمیں چھپتی رہتی ہیں، چاہے ان کا ایک بھی مصرع آپ یاد نہ رکھ سکیں۔ ایک نابالغ ذہن کا مالک تتبّع، محض تتبّع میں بعض وقت اچھی چیز میں لکھ مرتا ہے۔ انگریزی ادب کے گرے نے طفلی میں بڑا عمدہ نوحہ نہیں لکھا؟ پھر میں نے انگریزی میں لکھنا چھوڑ دیا۔ ہاں ہندوستان میں رہنا اور ہندوستانیوں سے بیر اچھا نہ معلوم ہوا۔ جب اردو کا رواج تھا اور اردو میں لکھنے والے اپنے آپ کو شاہی خاندان کا فرد سمجھتے تھے جیسے اب ہندی والے سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان کے دو روپ کہتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اردو میں شعر کہنے کی کوشش کی اور اس کے علم عروض۔۔۔ معقولن نامعقولن سے ٹکرا گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم دونوں بے

ہوش پڑے تھے یعنی کہ میں اور شعر۔۔۔ کہیں راستہ نہ پا کر میں چھوٹا سا "سینٹ جینے" ہو گیا۔

سینٹ جینے کو آپ نہیں جانتے، باپ روزاریو! وہ آپ کی طرح کا سینٹ نہیں۔ وہ چور، گرہ کٹ،۔ فاسق و فاجر ہے۔ عورتیں تو ایک طرف اس نے لونڈوں میں بھی دلچسپی لی ہے جو کہ میں نے نہیں لی۔ اس کے باوجود سارتر نے مقدس باپ پوپ کے فرائض خود پہ لے کر اسے معبود Deify کر دیا۔ ہر جگہ روک، ہر راستے کو سنگلاخ پا کر میرے بے پناہ جذبوں کے نکاس کے اور بھی بہت سے راستے ڈھونڈ لیے جن کا تعلّق کسی بھی تعمیری چیز سے نہ تھا۔ میں نے اندھیروں کی پناہ لی۔ اندھیرے کی بابت آپ نہیں جانتے فادر۔ پہلے خیرہ کر دینے والی روشنیوں کے بعد ایک لق و دق اندھیرا آتا ہے اور پھر ایک نرم سی مسلسل اور مقدس روشنی جس کا شروع ہے نہ آخر اور جس کے پر تو سے پوری کائنات جیتی اور سانس لیتی ہے۔ لیکن اندھیرا؟ اندھیرے کے جادو کا میں آپ کو کیا بتاؤں، باپ روزاریو، کیوں کہ وہ آپ کے تنگ و تاریک حجروں میں نہیں ہوتا۔ تاریکی کے باوجود وہاں تجلّی رہتی ہے۔ لیکن اپنی تاریکی خالص تاریکی ہے۔ آپ کے ہاں

کا اندھیرا اجالے سے متبادل (Mutate) ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اپنے ہاں، اندھیرے کی کوئی جگہ لیتا ہے تو اندھیرا، جیسے ایک صفر کو لاکھوں صفروں سے ضرب دیجیے تو نتیجہ صفر ہی رہتا ہے۔ اس اتھاہ اندھیرے میں عقل نہیں وجدان کام آتا ہے۔ اس میں کروڑوں اربوں دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ جذبات اور ارمانوں کے چھوٹے چھوٹے پشے اور بڑے بڑے شہ پر اڑتے ہیں۔ وہ آنکھوں سے نہیں، اپنی پرواز سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ کی مدد سے اپنے سامنے روک پا کر لوٹ آتے ہیں۔ لیکن ان کی پرواز کسی طرح سے کم نہیں ہوتی، ان کی بصیرت کے ہاتھ پر لاکھوں آنکھیں اُمڈ آتی ہیں جن سے وہ راستہ ٹٹولتے اور پاتے ہیں۔ جس دن اندھیرے کی تلاش میں نکلا اس دن ہمارے ایک بڑے روحانی پیشوا کا جنم دن تھا جس کی پوری اُمّت ایک طرف خوشیاں منا رہی تھی اور دوسری طرف مصروفِ عبادت تھی۔ جب ایک طرف میرے پورے بدن پر ڈر سے لرزہ چھا رہا تھا تو دوسری طرف ایک بڑی خوش آئند سنسناہٹ رگ و پے میں سما رہی تھی۔ چونکہ گناہ ثواب کا مقابل ہے، فادر، اس لیے انسانی جسم و ذہن گناہ سے اتنا ہی لطف اٹھاتے ہیں جتنی کہ ثواب کی بے حرمتی ہو۔ آہ، مگر کتنی دیر

کوئی اندھیرے میں رہ سکتا ہے؟ کتنی دیر اُجالے میں رہ سکتا ہے؟

کسی حکیم نے کہا ہے کہ وہ شخص جو اپنی منزل کو نہ پا سکے، اس آدمی سے زیادہ بے حیائی کی زندگی گزارتا ہے جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ سچ مچ، ایک تخلیقی ذہن کا مالک جب تخلیق نہیں کر پاتا تو وہ ایک عام آدمی سے بھی زیادہ گھٹیا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ اس انداز میں گرتا اور گرتا چلا جاتا ہے کہ اس کا اُبھرنا ناممکن ہو جاتا ہے تا وقتیکہ کہیں کوئی نغمہ نہ سُنائی دے جائے۔ پھر وہ معصیّت کی گود میں جانے کی بجائے اس کے پیروں پر لوٹتا ہے، جس سے معصیّت بھی موکش پا لیتی ہے۔۔۔۔ یہ سب کچھ سلیقے سے ایک شعر نہ لکھ سکنے کی بدولت ہوا، فادر روزاریو۔ میں نے اتنے گناہ کیے کہ میں انہیں گِن بھی نہیں سکتا۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے مجھے شرمندہ کرنا شروع کر دیا۔ ضمیر اپنا غرور رکھتا تھا اور بدن اپنا۔ ضمیر ایک حسین عورت کی طرح سے خود اعتماد ہوتا ہے اور اپنے آپ میں ذرا بھی تو کوئی دوسری خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہی شرط پر محبت کا قائل ہوتا ہے جو کہ اکثر مان لی جاتی ہے بلکہ ماننا ہی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وہ خوبصورت عورت یاد آتی ہے جس نے اپنے زعمِ حسن میں ایک فلم ڈائریکٹر کو، جس نے بے

شمار شادیاں کی تھیں، شرمندہ کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ "یاد ہے، میاں ایک بار تم نے مجھ سے شادی کی فرمائش کی تھی؟" ڈائریکٹر نے اسے اس سے آگے نہ بڑھنے دیا اور وہیں ٹوک کر کہا۔ "تب؟۔۔۔۔ میں نے کی تھی؟"

جس رات میں نے چوری کی اس رات ہر چیز چوری ہو جانے کے لیے اُڈی ہوئی تھی۔ شام کے وقت عام طور پر سورج آہستہ آہستہ غروب ہوتا ہے۔ اس کے غروب ہو جانے کے عرصے بعد تک بھی ایک روشنی سی رہتی ہے جو دھیرے دھیرے اندھیرے کو جگہ دیتی ہے۔ لیکن اس دن عجیب ہی بات ہوئی۔ ایک لمحے کے زمان و مکان کی قید کو توڑ دیا۔ اور اکائی بن کر میرے سامنے ساکت ہو گیا۔ اس سے فوراً پہلے آسمان پر جون کی دوپہر کا سورج تھا اور فوراً بعد دسمبر کی اماوس۔ یہ کہ کوئی ہزار واٹ کے ہنڈولے کو آن واحد میں گُل کر دے۔ قدرت میں بھی ہوتا ہے جب لاکھوں سر پٹخنے پر بھی مجھ سے ایک مصرعہ موزوں نہ ہوا تو میں نے ایک پرانا رسالہ اُٹھا کر اس میں سے احتیاطاً ایک گمنام شاعر کی غزل چرائی اور اپنے نام سے چھپنے کے لیے اخبار میں بھیج دی۔ اخبار والے تو آپ جانتے ہی ہیں، ہر اچھی چیز کو چھاپنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کے لیے کوئی

پیسے نہ مانگے۔ ہاں، کیونکہ اڈیٹر اور اس کا پورا خاندان بھی ہر ہفتے اخبار کو اپنی طبع زاد چیزوں سے نہیں بھر سکتے۔ غزل چھپ کر آئی۔ اس پر میرا نام تھا جو چھپا تھا۔ میں اسے دن میں بیس پچیس بار پڑھتا تھا اور بازار کی طرف نکل جاتا تھا تاکہ لوگ میری طرف دیکھیں۔ جب تک۔ کہیں اندر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ غزل میری اپنی ہے، لیکن۔۔۔۔۔

ہمارے گھر میں ایک شاعر مہمان رہتے تھے۔ انہوں نے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر میری غزل کی طرف۔ اور کچھ یوں داد دی کہ اسی پرچے میں "دزدِ سخن" کے عنوان سے میرے خلاف ایک دو کالمہ مضمون چھپا جس میں چوری کا ماخذ بھی درج تھا۔ اب میں بازار بھی نہ جا سکتا تھا۔

چوری کی بھی ایک منطق ہوتی ہے، باپ روزاریو! چوری۔۔۔۔۔ خیر ہٹائیے۔ میں دنیا بھر کی گھٹیا باتوں کے جواز میں فلسفے پیدا کر کے آپ کو بور نہ کروں گا۔ ہاں، یہ تو ہر لکھنے والے کے دائیں ہاتھ کا کام ہے یا شاید بائیں کا۔۔۔ کیونکہ بہت کم ایسے کام ہیں جن کے لیے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑیں۔ بہر حال، ایک بات طے ہے کہ ایک چوری دوسری چوری ضرور کرواتی ہے۔ جیسے ایک بدن کو

چھپانے کے لیے دوسرا بدن ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ لیکن میری وہ دوسری چوری پہلی چوری سے بہت مختلف تھی۔ میرے دماغ کی انوکھی منطق نے مجھے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر میں شعر نہیں لکھ سکتا تو میرا مہمان شاعر بھی نہیں لکھ سکتا کیونکہ اس کی شکل میری شکل سے بھی زیادہ دافعِ شعر تھی۔ وہ پلاٹیرو تھا۔ ایسا پلاٹیرو جو معصوم بھی نہ لگ سکے۔ وہ اس آلو کی طرح تھا، فادر، جو کاٹھ کا بھی نہیں بلکہ اصلی ہو اور جسے آپ عبادت کے لیے جاتے ہوئے آناً فاناً کہیں ببول پر بیٹھا ہوا دیکھ لیں اور جس سے آپ ڈر جائیں اور وہ بھی مجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ بھی شعر چوری کرتے ہوں گے؟ بڑے آسان طریقے سے جب وہ اپنا شیو بناتے تھے تو ٹھوڑی پر ہمیشہ کہیں نہ کہیں بالوں کا ایک ٹھنٹھ رہ جاتا تھا۔

دزدِ سخن والی رات میں اور میرے چھوٹے بھائی نے ان کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے صرف ان کی چوری کے ماخوذات نکالے، حالانکہ اس میں پیسے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ہندو سبھا کالج، امرت سر سے ایک رسالہ نکلتا تھا، جس کا نام 'شوالہ' تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چوریاں یاریاں سب شوالوں ہی میں ہوتی ہیں۔

ان کی چوری پکڑ کر جیسے مجھے سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔ جیسے میرے سب گناہ دُھل گئے، پہلی چوری اور بعد کی گرفتاری کا لرزہ ابھی تک بدن میں باقی تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ بُرا لکھوں گا لیکن اپنا بُرا کسی کا بُرا لکھنے سے کیا فائدہ؟

دیکھا، باپ روزاریو؟ بعض وقت کتنی اچھی چیز کی ابتدا کتنی گندی چیز سے ہوتی ہے۔ خود انسان ہی کو دیکھئے کیسے غلاظت میں لپٹا چلا آتا ہے اور پھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ سوائے کلیسا اور دوسرے مذاہب کی دیومالاؤں کے چند کرداروں کے، سب اسی طرح سے آئے اور کیا کچھ نہ بن گئے، ان کرداروں کی بھی محیّر العقول پیدائش کو عقل اور عقل محض کی لونڈی سائنس باور کرے یا نہ کرے لیکن میں تو کروں گا۔ بلکہ میں جو کہانیاں لکھتا ہوں اور میں نے اپنے پچھلے جنموں میں اپنے وجود سے بے شمار دیومالائیں لکھی ہیں۔ انسان کو ایسے ایسے طریقوں سے پیدا کروں گا کہ خود میری دیومالائیں دانتوں میں اُنگلی دبا کر میری طرف دیکھیں کیونکہ میرے نزدیک اس قسم کی عجیب الخلقت پیدائشوں میں بہت بڑا سچ ہے جسے میں جھوٹ سچ کہتا ہوں اور جس بات کو میں جھوٹ سمجھتا ہوں، فادر روزاریو، اسے میں سچ جھوٹ کہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ کوئی چیز ثابت وسالم

نہیں اور نہ اکائی کی حیثیت رکھتی ہے، سوائے اس خدا یا سو سوا سو عناصر کے جو مرکّب ہونے کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ سونا ان میں سے ایک ہے مگر اس کی حیثیت بھی اس وقت بنتی ہے جب وہ میری معشوقہ کے گلے کی زینت ہو۔ اگر اکائی ہی سب کچھ ہوتی، باپ روزاریو، تو پرماتما جو پُرش ہے، مزے سے اکیلا رہتا۔ کیوں اس نے اپنے لیے پر کرتی پیدا کر لی؟ کیوں ہر چیز کو نامکمّل رکھا اور مرکّب ہو جانے پر مجبور کر دیا؟ کیا اس لیے کہ موت میں بکھر جانے کا فن سیکھے؟ واہ! کیا فن ہے؟ وہ ایستادنی عفلہ جو نر کر دیا۔ اس کا کچھ حصّہ مادہ کو بھی کیوں دے دیا؟ میں بتاتا ہوں، کیوں؟ اس لیے کہ ہر چیز تکمیل کے لیے تڑپتی ہے اور اچھی اچھی کہانیاں پیدا ہوں، شعر کہے جائیں، تصویریں بنیں اور تانیں اڑیں۔ اکائی کوئی چیز نہیں، فادر! وہ صرف حساب کے کام آتی ہے اور اس سے پرے ہو کر بے معنی اور بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے روزمرّہ میں کوئی دھڑ سے کہہ ڈالتا ہے کہ ترلوچن کو پارو سے محبت ہو گئی۔ ٹھیک ہے، ہو گئی۔ مگر ترلوچن تین یا تیسری آنکھ رکھنے کے باوجود کیوں پارو پر قبضہ کرنا، اس سے شادی رچانا چاہتا ہے؟ کیوں اس پر جھپٹنے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ حسن کی تاب نہیں لا سکتا یا پارو

خود ہی مقبوض و تاراج ہونا چاہتی ہے؟ چونکہ دونوں ہی باتیں صحیح ہیں اس لیے میں جو ان کی محبّت کو آنے والی نسلوں اور اپنی کہانیوں کی خاطر تسلیم کرتا ہوں نفرت محبت کہوں گا۔ جو ترکیب میں نے ڈی ایچ لارنس سے لی ہے۔ اسی طرح کسی اوباش کی ایک دوشیزہ سے محبت کو محبت نفرت، ان کے رشتے کو انبساط و درد کا رشتہ۔۔۔ ایسے ہی بُلند و پست، اندھیرا اجالا وغیرہ۔ بہر کیف میں اپنی اس چوری کو اسی صورت میں سراہوں گا، فادر، اگر آپ میری کہانیوں کو اچھا سمجھتے ہوں تو ورنہ منزل اور اس تک پہنچنے کے ذرائع وغیرہ کے فلسفے کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ افسوس! آپ نے تو میری ایک بھی کہانی نہیں پڑھی۔ ایکا ایکی میری چار اچھی کہانیوں کے نام مت پوچھئے گا۔ پلاٹیرو۔۔۔ میرا مطلب ہے، فادر، کیونکہ ایکا ایکی پوچھ لینے سے تو میں اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں۔ میں نے اچھی کہانیاں لکھی ہیں جن میں سے ایک تو بائبل کی سیمسن اور دلائیلہ سے ٹکّر لیتی ہے۔ اچھا، میری کہانی نہیں پڑھی تو کرشن چندر کی "کنواری" پڑھی ہے؟ مجھے وہ بہت پسند ہے۔ واقعی جنسی جذبہ انسان میں نہیں مرتا، چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا اور بے کار کیوں نہ ہو جائے۔ جنسی جذبے کا براہ راست خالق سے تعلّق

ہے۔ نادر، جو ایڑا، پنگلا اور سشمن ناڑیوں کی مدد سے نیچے بدن میں آتا ہے تو بچّے پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے پیچھے تیسری آنکھ کے قریب آ جاتا ہے تو افسانے، میں نے بھی ''کنواری'' کی قبیل کی ایک کہانی ''لمبی لڑکی'' کے نام سے لکھی ہے، جس میں لڑکی اس قدر لمبی ہے کہ ہے کہ اسے اپنے قد کا لڑکا نہیں ملتا، اسی کڑھن میں اس کی دادی مر بھی نہیں پاتی۔ حالانکہ سامنے اس کا اپنا لڑکا لمبی لڑکی کا باپ دم توڑ دیتا ہے۔ آخر ناٹے قد کا ایک لڑکا اس لڑکی کو دیکھنے آتا ہے جسے اُٹھنے، چلنے، پھرنے کی ممانعت ہے کیونکہ ایسے میں اس کی لمبائی کے کھُل جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر شادی ہو جاتی ہے اور پھیروں میں لڑکی کو دوسری تہری ہو کر چلنے کی ہدایت ہے۔ کیسی بے بسی ہے جس میں وہ لڑکی اس ہدایت پر عمل کرتی ہے مگر نہیں جانتی؟ شادی کے بعد دولہا دولہن دونوں دور آسام چلے جاتے ہیں اور جب مہینوں کوئی خط نہیں آتا تو بڑھیا کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے میاں نے اسے نکال دیا ہو گا۔ سال کے بعد ایکا ایکی وہ وارد ہو جاتے ہیں مگر اس وقت بھی بڑھیا دھپ سے ہاتھ لڑکی کے سر پر مارتی ہے اور اسے نیچی ہو کر چلنے کے لیے کہتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھتی کہ اب یہ لڑکی اور لڑکے نے

ایک دوسرے کو دیکھ پرکھ لیا ہو گا۔ یہ کیسا ڈر تھا جس کا شروع اور آخر تو تھا لیکن بیچ کی منزلیں غائب تھیں؟ جب بڑھیا کو پتہ چلتا ہے کہ لڑکی پیٹ سے ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی پوتی بس گئی ہے۔ اب وہ تسلّی سے مر سکتی ہے لیکن مرنے سے چند ہی لمحے پہلے اس کے بوڑھے جھُریوں سے پٹے چہرے پر مُسکراہٹ چلی آتی ہے اور وہ لڑکی سے پوچھتی ہے۔ "ہائے ری مُنّی! تیرا وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہو گا؟"۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ داتا درن میں دایو ستو پریل ہو اٹھتا ہے اور بڑھیا کے سرہانے رکھی ہوئی گیتا کے پنّے ہوا میں اُڑنے لگتے ہیں اور اس جگہ پر آکر رُک جاتے ہیں جہاں شبد سپاپت لکھا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔میں اس کہانی میں آپٹیکل وژن کی بات نہیں کرتا جس میں لمبی سے لمبی لڑکی لیٹے میں چھوٹی ہو جاتی ہے بلکہ اس ترتیب اور ہم آہنگی کا قصیدہ کہتا ہوں جو انسانی دماغ ہر بے ہنگم چیز میں پیدا کر لیتا ہے۔ اس پر بھی کرشن چندر کی کہانی میری کہانی سے بہتر ہے۔ ہاں فادر! میں اپنے اس ہم عصر کی تعریف محض رقابت کے جذبے سے کر رہا ہوں۔ لیکن اسے رقابت رفاقت کہتا ہوں۔ وہ بھی ایسے ہی میرے ساتھ رفاقت رقابت کرتے آئے ہیں۔

حیف کہ آپ نے کرشن چندر کی کوئی کہانی پڑھی ہے، نہ عصمت کی اور نہ منٹو کی۔ آپ تو ناچ رنگ، سینما تماشے، قصّے کہانیوں کو اسی باتیں سمجھتے ہیں جو آپ کو ازلی حقیقت سے پرے لے جاتی ہیں۔ آپ کی نظروں میں وہ سب پاپ ہے جو ہندو فلسفیوں کے نزدیک ''پرے اور آپ'' کا مرکّب ہے۔ یعنی کہ وہ چیز جو آپ کو اپنے ''آپ'' سے پرے لے جائے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں فادر! کہ میں نے ہمیشہ اس آپ سے پرے ہٹنا چاہا کیوں کہ میرے نزدیک یہی انسانی حصول کی معراج ہے۔ کیا آپ نے مصری رقاصہ حلیمہ کے لچکیلے بدن کو رقص کے عالمگیر اثبات میں ہاں ہاں کرتے دیکھا ہے؟ کم از کم روسی بیلے میں مارگت فونیتن اور نیورئیف ہی کو دیکھ لیتے تو پتہ چل جاتا کہ خالق کا اپنی تخلیق سے کیا رشتہ ہے؟ روسی بیلے ڈانسر تو کثرتِ تعلیم کی وجہ سے اس بات کو نہیں جانتے، لیکن آپ تو جانتے ہیں؟ سونجا ہنی کو برف پہ اسکیٹ کرتے دیکھنے میں تو کوئی گناہ نہیں؟ کیسے وہ برف پہ خط اور دائرے بناتی، زندگی اور ماورا کے چکّر سمجھاتی ہے؟ کچھ نہیں تو اس برف ہی کو چوم لیتے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور جو آپ کے جسم و ذہن کا حصّہ ہو چکی ہے۔ آپ نے یہودی مینہوہن کی وائلن نہیں سُنی تو کیا روی شنکر اور

ولایت حسین کی ستار سُنی ہے؟ وہ بھی تو روح ہی کی آوازیں ہیں۔ سبو لکشمی "میرا" کے بھجن بھی تو گاتی ہے جس سے آپ اپنے مطلب کی بات سمجھ سکتے ہیں اور میں اپنے مطلب کی۔ بالا سرسوتی بوڑھی ہو گئی ہے فادر، یا گورو کرپ جوان ہو گیا ہے؟ حسین، آر، پرمسی اور گائی ٹونڈے محل نہیں بنا سکے حالانکہ ہمارے مندر، مسجد، گرجے اور ملوں کی چمنیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ باپ روزاریو! آپ شاید نہیں جانتے کہ ہمارے دیش کی ستی ساوتری بھی وہی بات کہتی ہے جو امریکہ کی ریٹا ہیورتھ، جب وہ اپنے میاں آرسن ویلز سے طلاق لیتی ہے۔ فرانسیسی ایکٹرس یاں مورد کی اداکاری دیکھی ہے اور اس کے بعد اس کا بیان پڑھا ہے جس میں وہ کہتی ہے کہ ان کے اوج کو چھُو لینے کے لیے میرے نزدیک اس ڈائریکٹر کے ساتھ سونا ضروری ہے جس کے ساتھ میں کام کر رہی ہوں؟ شیک ناچ والے بھی آپ ہی کی طرح سے اس بدن کو جھٹک دینا چاہتے ہیں جو روح کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ جرمنی کی نئی بیماری چومنے دو Let kiss کی راہ بھی روح کے مرکز کو جاتی ہے لیکن بدن سے ہو کر۔ آپ اگر مانتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں تو پھر عیسائی کون ہے، مسلمان کون اور

ہندو کون ؟ پھر میری کہانیوں سے استغنا کیسی ؟ تنہا آپ ہی نہیں، باپ روزاریو! جو کہانی کو مہمل بات سمجھتے ہیں۔ اور بھی بہت سے باپ ہیں۔ جب میں نے اپنی پہلی کہانی لکھی تو میں اتنا ہی خوش تھا کہ اس دنیا کی تخلیق کے بعد خدا خوش ہوا ہو گا۔ کیا دنیا کے ممکنات تھی جو میرے دماغ کے اللہ دینی چراغ نے میرے سامنے کھول دی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ گھر میں غریبی کا دور دورہ تھا۔ بڑوں میں سے فقط میرے بوڑھے تاؤ جی رہ گئے تھے جو کسی طرح سے ہمارے نان نفقے کے کفیل نہ ہو سکتے تھے کیونکہ ان سے اپنی چھوٹی سی زمینداری کبھی نہ چلتی تھی۔ ایک دن میں نے ان سے کہا۔۔۔ آپ سب بھول جایئے، تاؤ جی! مجھے کہانیاں لکھتی آ گئی ہیں اور میں ان سے بہت پیسے کماؤں گا۔ میرے تاؤ آپ سے بھی زیادہ بھولے تھے فادر روزاریو! وہ "چُپ تپ، ضیئم سچ سنجم" کے بہت قائل تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا تم زندگی بھر جھوٹ ہی کی کمائی کھاؤ گے، جاہن ؟"

جب سے میں برابر جھوٹ بول رہا ہوں فادر، لیکن اسے جھوٹ سچ کہتا ہوں۔ یہ ترکیب میں نے اپنی آسائش اور سہولت کے لیے نہیں بنائی بلکہ میں اس کا قائل

ہوں۔ آپ کے خدا کی زبان بھی خالص سچ نہیں ہے۔ وہ بھی کنایے میں بات کرتا ہے۔ اس نے کبھی سامنے آکر سچ کے طریقے سے نہیں کہا۔ میں ہوں۔۔۔ اس نے کسی قتل کے مقدمے میں گواہی نہیں دی۔ حالانکہ بعض حالات میں قتل صرف اسی نے دیکھا ہوتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے۔۔۔ تم ہو اس لیے میں ہوں۔ گواہ ڈھونڈنے کے لیے دوڑو، بھاگو اور اگر کوئی نہ ملے تو پیدا کر لو۔ آدمی سخت پریشان ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ آج گواہ کو پیدا کرنا شروع کیا تو وہ کتنی دیر میں پلے گا اور پل کر جوان ہو گا؟ وہ کہتا ہے، میری مملکت میں انگلیوں کی لکیریں مسکت گواہی دیتی ہیں، اینٹ پتھر بھی بولتے ہیں۔ ان کا بیان نہ لے سکو تو ایسے ہی کان کھول کر پھرو۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں قاتل کی آستین کا لہو پکار رہا ہو گا۔ اگر وکیلوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے قاتل بری ہو جائے تو بھی وہ کچھ نہیں کہتا۔ ضرور پچھلی زندگی میں مقتول نے قاتل کو قتل کیا ہو گا۔ اس لیے اس زندگی میں حساب بے باق ہو گیا۔ وہ ہمیں کبھی ایک خوبصورت سا خرگوش ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور کبھی بدصورت سا خارپشت۔ یہ اس کی کہانیاں اور پہلیاں ہیں جو ہماری سمجھ کو آزماتی ہیں اور اسے صقیل کرتی ہیں۔ پنجابی شاعر گلیریا کے مطابق اس نے

گلاب کو بیسیوں زبانیں دی ہیں لیکن وہ چُپ ہے۔ اگر بات کرتا ہے تو اشارے کی زبان میں۔ خدا کی اپنی زبان بھی تلمیح (Allusion) کی ہے اور وجود التباس (Illusion) کا وہ خود مایا کی معرفت باتیں کرتا ہے اور کبھی ٹھیٹ سچ نہیں بولتا۔ گلیلیو، منصور، سقراط، عیسیٰ اور گاندھی اسی لیے مارے گئے کہ انہوں نے خالص سچ بولا اور جھُوٹ سے سچ کی عظمت کو نظر انداز کر گئے۔ انہوں نے اپنے سامنے لوگوں کو اس سلسلے میں شہادت پاتے ہوئے دیکھا۔ مگر یہ بھول گئے کہ انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن سامنے کا سچ نہیں۔

آپ کھرے کھرے سچ میں یقین رکھتے ہیں، باپ روزاریو! تو لیجئے میں آپ کو کچھ سچّی باتیں اپنی کہانیوں کے سلسلے میں بتاتا ہوں، وہ بالکل سچّی ہیں۔ دیسی گھی کی طرح خالص اور گاڑھی گاڑھی۔

میں نے اپنی کہانی "ببّل" میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ مرد اور عورت کے بیچ خوش وقتی برحق ہے، لیکن انسانی معاشرے کا کوئی بین نقشہ سوائے اس بات کے نہیں بنتا کہ مرد اور عورت شادی کریں اور اس کے بعد بچّوں کی ذمہ داری قبولیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے جنسی فعل میں تقدیس پیدا ہو سکتی ہے۔

جسے دنیا کے ننانوے فی صدی لوگ گندہ اور نجس سمجھتے ہیں اور اسے دردناک بلکہ شرمناک مجبوری گردانتے ہیں۔۔۔ درباری لال ایک بچّے ببّل کو اس کی بھکارن ماں مصری سے کرائے پر لے کر سیتا کو ہوٹل میں لے جاتا ہے تو سب اسے خوش آمدید کہتے ہیں حالانکہ اس سے ایک ہی روز پہلے کسی دوسرے ہوٹل والے نے اسے لُچّا لفنگا کہہ کر بھگا دیا تھا، ہاں جب وہ سیتا کے ساتھ ہم بستری کرنے لگتا ہے تو ببّل رونے لگتا ہے۔ درباری اسے مارنے کے لیے دوڑتا ہے، لیکن نیم عریاں سیتا دوڑ کر بچّے کو پکڑ لیتی ہے اور اسے اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ وہ درباری کو دنیا کا اسفل ترین آدمی سمجھتی ہے جس نے اس کام کے لیے ایک معصوم بچّے کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہے، بچّے کے ساتھ جو عورت۔۔۔ ماں کا غیر منفک حصّہ ہے اور ایسی نظروں سے درباری کی طرف دیکھتی ہے کہ اس پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔ وہ اسی منفعل حالت میں سیتا سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ پہلے شادی کرے گا۔۔۔۔۔ جس بچّے سے میں نے کہانی کا پلاٹ لیا ہے، باپ روزاریو! اس میں میرے ہیرو نے وہسکی پی کر اور پانچ روپے والا پان کھا کر سیتا کی اس حد تک آبروریزی کی تھی کہ وہ نیم مردہ حالت

میں ہسپتال لے جائی گئی اور جلّاب سے بچّے کے پیٹ میں سے افیون اور اس کا اثر دور کیا گیا۔۔۔ اور سچ کہوں؟ ”ٹرمینس سے پرے“ میں موہن جام وکٹوریہ ٹرمینس کے اسٹیشن پر اپنی بیوی کو پہاڑ پہ جانے کے لیے رُخصت کرتا ہے۔ گاڑی چلتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی واقف کار اچلا نے اُسی گاڑی میں اپنے شوہر کر دلّی کے لیے رُخصت کیا ہے۔ موہن جام اُچلا کو اسی کار میں لفٹ دیتا ہے اور اس طریقے سے آگ اور تیل کا گھٹیا سا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے تضادات ایک طرف گناہ کے محرک ہوتے ہیں تو دوسری طرف سدِّباب بھی۔ اچلا مومن جام کو زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے اور کہتی ہے۔ ”کیا مرد ادر عورت کے درمیان اور کوئی رشتہ نہیں بنتا؟ کیا وہ بہن بھائی نہیں ہو سکتے؟“ ۔۔۔۔۔ موہن جام برافروختہ ہو کر اسے بہن کہہ دیتا ہے لیکن۔۔۔۔

اُدھر موہن جام کی بیوی سومتر الوٹ آتی ہے اور اِدھر اچلا کا شوہر رام گدکری۔ رکشابندھن کے دن موہن جام تین ساڑھے تین سو کی ساڑھی اور سو روپیہ نقد

اچلا کی نذر کرتا ہے۔ حالانکہ اس شہر میں اپنی سگی بہن کو اس نے صرف دس روپے دیے تھے۔ اُچلا اس دن صبح ہی سے سجتی بنتی رہی تھی اور اس نے جو رکشا موہن جام کے لیے بنائی تھی، اس میں کلابتوں کے علاوہ سچّے موتی ٹانکے تھے۔ موہن جام رکشا بندھوا کر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے چلا جاتا ہے. جبھی اُچلا کے اعضا جواب دے جاتے ہیں اور وہ اپنے میاں رام گدکری سے لپٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے۔ "مجھ سے پیار کرو، اور، اور۔۔۔۔۔" حقیقت یہ ہے کہ موہن جام اور اُچلا نے باہمی سازش سے علی الترتیب اپنی بیوی اور اپنے میاں کو بھجوا دیا تھا۔ اب اچلا کے ہاں ایک بچّہ ہے جسے اچلا کا شوہر رام گدکری اپنا سمجھتا ہے اور اس سے کھیلتے ہوئے کہتا ہے؟ "میرا چنو، میرا منو۔۔۔۔۔"

یہ نہیں کہ دنیا میں ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت اور بدکاری ہی بدکاری ہے۔ نیکی کا سچ یہ ہے کہ میرے افسانے "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی اندو اپنی حقیقی زندگی میں اتنی بُلند کردار بن چکی ہے کہ اسے اپنے سوا اور کوئی آدمی اچھا ہی نظر نہیں آتا۔ سب گندے اور غلاظت سے اٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے لڑکے، اس کی لڑکیاں، حتیٰ کہ اس کا شوہر بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ سب اپنی پہلی

فرصت میں اس سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اکیلی بیٹھی پوجا پاٹھ کیا کرتی ہے اور سبھی کبھی آنے جانے والوں کو اس کی دہشت ناک ہنسی سنائی دیتی ہے۔

سچ سننے کی تاب کس میں ہے، باپ روزاریو؟ نہیں میں سچ نہ بولوں گا یا ایسا سچ بولوں گا جو آپ کے سچ سے ارفع ہو۔ یعنی اس میں جھوٹ کی حسین سی آمیزش ہو۔ ایسا نہ کروں گا تو معاشرے میں طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔ لوگ مجھے مار دیں گے اور میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی سے بڑی کمینہ سی محبت ہے۔ میں شہادت کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ وہ کسی دوسرے کی ہو۔ میں اپنی پیٹھ پر صلیب اٹھاتا ہوں۔ لیکن اس اُمّید میں کہ ایک دن اسے جھٹک دوں گا۔ پہلے میں بہت بے ضرر قسم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ فادر! جن کا تعلّق سطح محض سطح سے تھا۔ اب جب کہ میں نے انسان کے تحت الشُعور میں جانے کی کوشش کی ہے تو پہلے ہی نقّادوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تم جنس پہ لکھنے لگے ہو۔ میں جنس پہ لکھتا بھی ہوں، باپ روزاریو! تو ایک ذمّے داری کے احساس کے ساتھ۔ ایسے ہی ارتعاش پیدا کرنے یا مرتعش ہونے کے لیے نہیں۔ یوں مجھے اپنے گناہ جو پوری طرح سے

گناہ نہیں بن پاتے بے حد عزیز ہیں۔ دراصل میں آپ کے پاس اتنا اعتراف گناہ کے لیے نہیں آیا جتنا یہ بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ میں اور گناہ کروں گا تاکہ آپ کی نوکری بنی رہے۔ میں مجبور ہوں، باپ روزاریو! جب گناہ کی گھڑی آتی ہے تو میرے جسم و ذہن بلکہ کام و دہن اسی طرح سے کانپنے لگتے ہیں۔ جیسے آپ حسنِ ازل سے دوچار ہو کر۔ میں بھی اپنے میدان عمل میں ایک طرح کا پادری ہو گیا ہوں۔ قاتل خود مقدمے کی سماعت کے لیے میرے پاس آتے ہیں۔ میرے لکھنے کے کمرے میں جو ڈیڈ پلانٹ ہے، اس نے روٹھ کر مجھ سے کہا۔ ''دو دن ہو گئے تم نے مجھے پانی ہی نہیں ڈالا۔'' میں کیا جواب دیتا۔ میں نے شرارت سے کہا۔ کَے روز ہو گئے تم نے مجھے گھاس ہی نہیں ڈالی۔ وہ ہنس پڑا اور میں بھی رو پڑا۔ اس کے بعد میں نے اس کے پتّوں کو چوما۔ ہاتھ سے اپنے بدن کی حرارت دی جو کثرتِ گناہ سے ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔ اسے مجھے اپنے بدن کی ہری ٹھنڈک دی۔ میرے گھر کے سامنے ایک ڈسٹ بن ہے جہاں محلّے کے لوگ کوڑا کرکٹ پھینکے ہیں۔ اس میں ڈبل روٹی کا ایک سلائس پڑا تھا۔ میں کہیں اُدھر سے گزر رہا تھا کہ کوڑے کے ڈھیر میں سے سر اٹھا کر اُس نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو دیکھو جاہن مجھے

کہاں پھینک گئے ہیں؟ یہ میری جگہ نہیں ہے۔ جب کہ اسی سڑک کے موڑ پر، پان والے کی دکان کے پاس کئی بھوکے گھوم رہے ہیں۔ ابھی ابھی میرے پروڈیوسر نے کہا ہے کہ پکچر آگے نہیں چلے گی کیوں کہ ہماری ہیروئن حاملہ ہوگئی ہے۔ اب ہم اور ہمارا پورا یونٹ اگلے چھ آٹھ مہینے تک بے کار رہیں گے اور ہیروئن کی صحت کے لیے دُعائیں کرنے پر مجبور، یا ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹول کریں گے جو کہ ہر آدمی بیکاری میں کرتا ہے!

سامنے ڈان باسکو اسکول کا گرجا دیکھ رہے ہیں نا؟ اس میں بجنے والے گھنٹے کی آواز بے حد خوب صورت ہے۔ میں مندر اور مسجد وغیرہ میں تو نہیں جاتا، لیکن گھنٹوں کی آواز اور اذان مجھے بہت پیاری لگتی ہیں۔ میں ان کی بازگشت کا پیچھا کرتا ہوا اتنی دور نکل جاتا ہوں کہ آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں انہی کی طرح لطیف سے لطیف تر ہوتا جا رہا ہوں۔ روح کا تو وزن نہیں ہوتا، میرا بدن بھی بے وزن ہو جاتا ہے اور میں پوری کائنات پہ پھیل جاتا ہوں۔ جب میری شکل جاہن کی نہیں رہتی میں وہ پرماتما بن جاتا ہوں جو "اروپ" اور "نراکار" ہے۔ مجھے خدا کی اس بے صفتی سے بے حد محبت ہے

کیونکہ اس کی اسی صفت سے ہم جو کہانیاں لکھتے ہیں اور تصویریں بناتے ہیں اپنے لیے گنجائش پاتے ہیں۔ جیسے ہم بھی اپنے طریقے سے چھوٹے چھوٹے خدا ہیں۔ جب میں اپنے دل کی خوب صورت گھلاوٹ میں گلیریا کی نظم پڑھتا ہوں۔

اے اروپ! میں بھی تو روپ ہین ہوں۔

تیرے روپ کی جیوتی، میرے آکار کی سیاہی کو روپ مان اور اُجاگر کر دیتی ہے۔

تیرے روپ کی جیوتی۔۔میرا جیون آدھار ہے۔

اس کے بنا میرے وجود کا رنگ اور میرے آکار کے چتر مجھ ہی میں گُم ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔

فادر روزاریو! میں اپنی اس آگہی سے کبھی خود ہی متوحش ہو اُٹھتا ہوں۔ آپ اندازہ کیجیے۔وہ آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے جسے اپنی روح کے اندھیرے میں ایک ساتھ لاکھوں کروڑوں آوازیں سُنائی دیں۔ جو اس قدر لطیف ہو جائے کہ خود کو بھی ڈھونڈنے پر نہ پا سکے۔ جب آگہی آتی ہے تو آپ اپنی ذات میں ہزاروں معجزے ہوتے دیکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر کثیف و لطیف چیز کا رشتہ سمجھ لیتے ہیں اور

جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ایک بے بضاعت سی چیونٹی بھی استعارہ بدوش آپ کے سامنے چلی آتی ہے۔

کیا کہا، باپ روزاریو؟ آپ کلیسا چھوڑ رہے ہیں؟ نہیں فادر خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔ میری طرح اکیلے جینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کی قبیل کے اور لوگ جی ہی نہیں سکتے جب تک وہ کسی مذہب، فرقے یا گروہ سے تعلّق نہ رکھتے ہوں۔ میں نے جو بھی جھوٹ سچ بولا ہے، وہ ہر کسی کے کام کا نہیں۔ آپ نے کلیسا چھوڑ دیا تو آپ مر جائیں گے اور وہ بھی پاگل ہو کر۔۔۔۔

مجھے اجازت دیجیے فادر!۔۔۔۔ وہ آدمی جو ایک مرد اور عورت کے جھگڑے میں پڑ گیا تھا اور عورت کو الگ لے جانے کے بعد آج تک لوٹا ہی نہ تھا، ایکا ایکی کہیں سے چلا آیا ہے۔ میں جا کر ذرا اس سے پوچھوں تو کہ آخر بات کیا ہوئی؟

صرف ایک سگریٹ

سنت رام کی آنکھ کھُلی تو اس وقت چار بجے تھے، صبح کے۔

ساتھ کے بستر پہ دھوبن سو رہی تھی۔۔۔ ایک پہلو پہ۔ دھوبن سنت رام اپنی بیوی کو کہتا تھا۔ اس کا نام اچھا بھلا دیبی تھا، لیکن سنت رام اسے اسی نام سے پکارتا تھا کیوں کہ وہ لانڈری میں کپڑوں کی دھُلائی کے بہت خلاف تھی۔ گھر میں نوکر چاکر، پرماتما کا دیا سب ہوتے سوتے وہ رومال سے لے کر بھاری بھاری چادریں تک گھر ہی میں دھوتی تھی۔ جب تھک جاتی تو سب سے لڑتی اور لانڈری کے

خرچ سے بہت مہنگی پڑتی۔ پھر رات کو سونے سے پہلے وہ ہمیشہ دبائے جانے کی فرمائش کچھ اس انداز سے کرتی کہ فرمائش اور حکم میں کچھ فرق ہی نہ رہتا۔ دبانے کی اس مصیبت سے سنت رام تو کیا، دھوبن کے بچّوں تک کو چڑ تھی۔ کوئی پانچ نہیں تو حد دس منٹ دبوائے لیکن یہ کیا کہ کوئی گھنٹے بھر سے ادھر چھوڑنے کا نام ہی نہ لے۔ عجیب تماشا ہوتا تھا۔ آخر دبانے والے کو خود بے دم ہو کر لیٹ جانا پڑتا تھا۔ ایک دن بڑی بیٹی لاڈو کے ساتھ یہی معاملہ تو ہوا۔ ماں کو دبانے کے بعد وہ ہانپتی ہوئی پلنگ کے ایک طرف جا گری اور بولی۔۔۔ اب تم مجھے دبا دو، ممّی!

پھر اس دبنے دبوانے کے سلسلے میں ایک اور بڑی مصیبت تھی۔ دھوبن کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اسے درد کہاں ہو رہا ہے۔ جہاں ہاتھ رکھو، درد ہمیشہ اس سے تھوڑا پرے ہوتا تھا۔ اور یوں جگہ ڈھنڈواتے ڈھنڈواتے، وہ سارا بدن دبوا لیتی تھی۔ کوئی کہے یہ اس کی چالاکی تھی، تو ایسی بات نہیں۔ اُسے واقعی پتہ نہ چلتا تھا اور آخر یہ فیصلہ ہوتا کہ سارا بدن دُکھ رہا ہے۔ اچھا، دھوبن کو دبوانے کا ہی نہیں، دبانے کا بھی شوق تھا۔ اشارہ تو کرو اور وہ تیّار۔ البتہ یہ کام اس سے کوئی کم ہی کرواتا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ کیا تھا، مستری کی پکڑ تھی جس سے وہ اچھے بھلے آدمی کے نٹ

بولٹ کستی اور اس کی ڈھبری ٹائٹ کر دیتی تھی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت نہ صرف مردانہ، بلکہ پہلوانا تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی کو نہیں دبا رہی، کوئی بیڈ کور نچوڑ رہی ہے۔ سنت رام تو اس کے دھوبی پاٹے سے بہت گھبراتا تھا۔ دھوبن۔۔۔ ہاں، سنت رام نے اس کا یہ نام اس لیے بھی رکھا تھا کہ بچپن میں اس کو سیر بین میں بارہ من کی دھوبن دیکھی تھی جو نیم برہنہ حالت میں پہلو پہ لیٹی، ہاتھ میں مور کے پروں والا پنکھا لیے ایک بھرپور عورت معلوم ہوتی تھی۔ سیر بین والا اپنے ڈبّے پہ گھنگھرو بجاتا ہوا گلی میں آتا تھا اور آواز دیتا تھا۔ پیرس کی رات دیکھو، اپنی بارات دیکھو۔۔۔ اور پھر ٹیون بدل کر۔۔۔ دھوبن دیکھو بارہ من کی، گوری چِٹّی آہا تن کی۔۔۔ آہا!۔۔۔ اور سب بچّے ماؤں سے ایک ایک پیسہ لا کر اس جادُو کے بکس والے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنا چہرہ اور آنکھیں سیر بین میں ٹھونس دیتے تھے اور نظاروں سے پورا پورا لطف اُٹھاتے تھے۔ پیرس، بارات، سفید ریچھ، سرکس کے جوکر کے بعد جب دھوبن آتی تھی تو بچّوں کو کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ سوچتے دھوبن کیوں اس بکس میں قید کر رکھی ہے؟ مہینہ پہلے بھی وہ ایسے ہی لیٹی ہوئی تھی اور آج بھی لیٹی ہوئی ہے۔ ایک پہلو پہ لیٹے لیٹے کیا وہ

تھک نہیں جاتی؟ دھوبن ایک نامحسوس طریقے سے بچّوں کو اچھی لگتی تھی۔ وہ دماغ میں گھس جاتی تھی اور کہیں پندرہ بیس برس کے بعد باہر نکلتی۔

ساتھ کے کمرے میں لاڈو، سنت رام کی مشدود (اُس کی لغت میں شادی شدہ) لڑکی جو ایک روز پہلے اپنی سسرال سے آئی تھی، سورہی تھی۔ کچھ ایسی بے خبری میں، جیسے اس کا کوئی میاں ہی نہ ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا کیونکہ رات کے پہلے پہر کمینے بابی، اس کے بچّے نے اُسے سونے ہی نہ دیا تھا، اور جب اسے نیند آئی تو سانس لینے کے لیے زیادہ ہوا کی ضرورت پڑی۔ لاڈو جیسے شادی کے چھ برس پہلے تھی، ویسے ہی اب بھی تھی۔ بات کرنے میں منہ سے پانی کی پھوار سننے والے کے منہ پر پڑتی تھی۔ جیسے وہ روٹھتی، ویسے ہی من بھی جاتی۔ سنت رام اور دھوبن کو یہی فکر تھی، یہ اِتّی بھولی بیٹی ہماری بسے گی کیسے؟ اسے کوئی مشکل پسند میاں مل گیا تو مصیبت ہو گی۔ لیکن اسے میاں جو ملا، تو اُس نے کوئی شرط ہی نہ پیش کی اور نہ اب پیش کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ اِدھر اس گھر میں ماں باپ کی ناچاقی، اُدھر لاڈو کی سسرال میں والدین کی کثرتِ محبت یا ایسے ہی دنیا کے مشترک ڈرنے دونوں میاں بیوی کو ایک مضبوط رشتے میں باندھ رکھا تھا۔ بہادر دونوں اتنے

تھے کہ گھر میں چوہا نکل آنے پر بھی چیختے چِلاّتے۔ ایک دوسرے کی پناہ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ سنت رام ان کے چڑیا کا سا دل رکھنے پر بہت خوش تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بہت سے منفی جذبے زندگی کے لیے کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈر، کنجوسی، شرم وغیرہ۔ لیکن یہ ڈر تو اولادوں تک منتقل ہو رہا تھا۔ لاڈو کے ساتھ اس کا مُنّا بابی سویا ہوا تھا۔۔۔ ماں کے گلے میں بانہہ ڈال کر۔ جب ذرا نیند کھلتی تو اس کے کان ملنے لگتا، جانے یہ کیا عادت تھی اس کی، جسے صرف اس کی ماں ہی برداشت کر سکتی تھی۔ سنت رام نے جب بھی محبت کے جذبے سے معمور ہو کر دوہتے کو ساتھ سلایا، تو تھوڑی ہی دیر میں گھبرا کر اُسے اُٹھاتے ہوئے پھر اس کی ماں کے ساتھ ڈال دیا۔ سوتے میں بانہہ گلے میں ڈالنے کی بات اتنی نہ تھی، البتہ جب وہ اپنے لجلجے ہاتھوں سے کان مسلنے لگتا تو عجیب سی گدگدی ہوتی اور کبھی یوں معلوم ہونے لگتا، جیسے کوئی کنکول کان میں گھس رہی ہے۔

چھوٹے دو بچّے، لڑکا اور لڑکی اپنے ماموں کے ہاں گُڑ گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ان کے بستر خالی پڑے ہوئے بے کاری کے عالم میں پڑے چھت کو تکا کرتے۔ بڑا پال یہیں تھا، جس کے خرّاٹے سُنائی دے رہے تھے۔ کیسے دیکھتے دیکھتے وہ بڑا ہو

گیا تھا، اور سنت رام کے تسلّط سے نکل گیا تھا۔ پہلے سنت رام اسے اس کی غلطی پر ڈانٹتا تھا تو وہ مختلف طریقوں سے احتجاج کرتا تھا۔ ماں سے لڑنے لگتا، چائے کی پیالی اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتا، لیکن اب وہ باپ کی ڈانٹ کے بعد خاموش رہتا تھا، جو بات سنت رام کو اور بھی کھِل جاتی۔ سنت رام چاہتا تھا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے اور جب وہ کہیں جواب دے دیتا، تو سنت رام اور بھی آگ بگولا ہو اُٹھتا۔ وہ چاہتا تھا بیٹا اس کی بات کا جواب دے اور نہیں بھی چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ چاہتا کیا تھا؟ سنت رام نے اپنے بیٹے پال کے سلسلے میں اپنی زندگی کا آخری چانٹا کوئی چھ برس پہلے مارا تھا، جو اب تک گھِس چکا تھا۔ اب تو وہ اس سے ڈرنے لگا تھا۔ آج بھی پال حسب معمول رات کے دو بجے آیا تھا، ڈپلومیٹ کے دو چار پیگ لگا کر۔ وہسکی کی اصلی مہک تو گھر کے لوگوں نے نیند میں گزار دی تھی لیکن اب بھی اس کے اُلٹے سانس میں سے بُو آرہی تھی۔

پال چھبیس ستائیس برس کا ایک دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ اندر ہی اندر کڑھتے، کھولتے رہنے سے اس کے بدن پہ بوٹی نہ آتی تھی۔ اس کے باوجود چہرے کی بناوٹ، اور مونچھوں کی ہلکی سی تحریر کے ساتھ وہ مرد کے طور پر قابلِ قبول تھا۔ عورتیں

اسے بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ بچّوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ کردار کے اعتبار سے پال اُمنگ بھرا تھا اور جاہ طلب بھی۔ اس میں اَنا بے انتہا تھی۔ یہ اَنا جس کی وجہ سے اس کی ناک کے نتھنے پھٹے جاتے تھے اور وہ بڑے زور دار طریقے سے اپنے آپ کو پال آنند کے نام سے متعارف کراتا تھا، جیسے وہ کوئی روایت ہو۔ یہ روایت اس نے کہاں سے پائی تھی؟ اپنے باپ، سنت رام ہی سے نا، جو ایک بہت بڑی ایڈورٹائیزنگ ایجنسی کا مالک تھا اور جس نے اپنے بیٹے کو شہزادے کی طرح سے پالا تھا۔ اس کی ماں دھوبن سے چوری چوری رقمیں دی تھیں اور اس عمل میں اپنی بیوی سے اپنے تعلقات خراب کر لیے تھے۔ پھر اس نے پال کو عافیت کی چھت دی تھی۔۔۔ ایک ایسے مکان کی چھت، جس میں تین بیڈروم تھے اور ایک شاندار ڈرائنگ روم، جس میں اُستادوں کی پینٹنگ تھیں۔ پھر دن میں دو دو بار بدلنے کے لیے کپڑے۔ یہ سب اپنے باپ سے لے کر وہ کیوں اُسے بھول گیا تھا؟ صرف یہی نہیں، اس سے نفرت کرنے لگا تھا اور یوں پاس سے گزر جاتا تھا، جیسے وہ اس کا باپ نہیں، کوئی کرسی ہو۔ اگر حکومت نے کوئی نیا قانون پاس کر دیا جس سے کمپنی فیل ہو گئی، تو اس میں سنت رام کا کیا قصور؟ زندگی میں نفع ہوتا ہے

اور نقصان بھی۔ یہ کیا مطلب کہ نفع کے وقت تو سب شریک ہو جائیں اور نقصان کے وقت نہ صرف الگ ہو بیٹھیں، بلکہ گالیاں بھی دیں؟ لیکن اس میں پال کا زیادہ قصور نہ تھا۔ وہ آج کل کے زمانے کا لڑکا تھا اور صرف اسی شخص کی عزّت کر سکتا تھا جس کے پاس پیسہ ہو، یا اس کے ڈھیر سارے پیسے بنانے، بلڈنگیں کھڑی کرنے اور اِمپالا کار خریدنے کا امکان ہو۔ ایک بار سنت رام کے سوال پہ پال نے یہ بات کہہ بھی دی، جس سے بوڑھے کو بہت ٹھیس لگی۔ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا، اس کا اسے خود بھی اندازہ نہ تھا۔ اس کا کتنا جی چاہا تھا کہ وہ کہیں چوری چاری کر کے، ڈاکا ڈال کے یا بینک ہولڈ اَپ کر کے لاکھ روپے بنائے اور اس بیٹے کے پاؤں میں پھینک کر اس کی اور اس کی ماں کی نظروں میں اپنی کھوئی توقیر پھر سے حاصل کر سکے۔ لیکن لاکھ روپیہ کھلے کھلے نہیں، شاطرانہ ڈاکے سے بنتا ہے، جس کی استعداد سنت رام میں نہ تھی۔ جب خسارہ ہوا تھا تو دھوبن یا لاڈو یا پال میں سے کسی نے اتنا بھی تو نہ کہا۔۔۔ اے جی، یا پپّا، کوئی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے۔ آپ جی میلا کیوں کرتے ہیں؟ جیسے کھویا ہے، ایسے ہی پا بھی لیا جائے گا۔ جو پیسہ بنانے نکلتے ہیں، کھو بھی دیتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ

ہر نقصان اُٹھانے والا بے وقوف ہوتا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی، جیسے ہر پیسہ بنانے والا عقل مند ہوتا ہے۔ کیوں سب نے اسے بوڑھا اور سٹھیایا ہوا سمجھ لیا اور بیسیوں بار اس کی طرف دیکھے بغیر پاس سے گزر گئے تھے اور اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے؟ اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ اگر پھر سے اس کی مالی حالت اچھی ہو جائے، تو وہ ان گزری ہوئی باتوں کو دل میں رکھ کر ایک ہنٹر ہاتھ میں پکڑ لے اور کسی بھی عنایت سے پہلے بیوی اور بچّوں کو مار مار کر نیلا کر دے۔ نہیں؟ یہ شوہر اور باپ کا کرتویہ نہیں۔ لیکن یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ باپ کا کرتویہ پیار دینا ہی ہے، لینا نہیں۔ گویا اسے پیار کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پیار کی ضرورت کیسے نہیں ہوتی؟ ایک سال کے بچّے کو ہوتی ہے، تو سو سال کے بوڑھے کو بھی۔ اور تو اور اپنے کاکر نپئیل جمّی کو بھی ہوتی ہے جو اس وقت کہیں اپنے ڈربے میں پڑا سو رہا ہے اور بیچ بیچ میں کہیں سے کوئی آواز آنے پہ بھونک اُٹھتا ہے۔ کیسے پیار کی نظریں اس کی نظروں سے ملتی ہیں، تو ایک پیغام اس کے دماغ سے دم تک چلا جاتا ہے جو کہ نہ صرف خود بے تحاشا ہلتی ہے، بلکہ سارے بدن کو بھی ہلا ڈالتی ہے۔ جس دن اسے کوئی ایسی نظروں سے نہ دیکھے،

وہ کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ گویا کہہ رہا ہے، میں بھوکا رہ سکتا ہوں، لیکن پیار کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہاں دھوبن لاڈو، پال نے اسے جمّی کے برابر بھی نہ سمجھا تھا۔

شاید یہ سب اس لیے تھا کہ سنت رام نے زندگی میں صرف دینا ہی سیکھا تھا۔ اور اب یہ اس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جب دیتا تھا تو جیتا تھا۔ لینے میں اس کی روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اسے کاروبار میں خسارے کا اتنا غم نہیں، جتنا اس بات کا ہے کہ اب وہ دے نہیں سکتا۔ اور جب گھر کے لوگ چپکے میں پاس سے گزر جاتے تھے، تو وہ ان کی خاموشی کا عجیب اُلٹا سیدھا مطلب نکالتا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ لینے والوں کو بھی عادت پڑ سکتی ہے۔۔۔ لینے کی۔ پھر دنیا بذاتِ خود ایک سامراجی عمل ہے جو لینے والوں، محکوموں کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔ اس سلسلے میں سنت رام بہت سفّاک واقع ہوا تھا۔ اس نے کئی بار اُدھار لے کر بھی بیوی بچّوں کو تحفے دیے، جو اُنہوں نے لے کر رکھ لیے اور بے شعوری کی کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے لگے۔ کسی نے شکریے کا ایک لفظ بھی تو نہ کہا اور نہ تشکّر کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سب نے کتنے کمینے اور بزدلانہ طریقے سے اپنی محبت روک لی تھی، یا شاید سنت رام کو اپنے گھاٹے کا اس قدر احساس ہو

گیا تھا کہ گھر کے لوگوں کی نگاہوں میں اسے اپنے لیے تحقیر کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اپنے لیے نفرت اور تحقیر ہی کو پسند کرنے لگا ہے اور اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی حالتِ زار پہ چند آنسو نہ بہا لے۔۔۔

دھوبن کی چوبیس گھنٹے کی نیگنگ اور نصیحتوں کی سنت رام کو اتنی پروا نہ تھی، کیوں کہ وہ اَن پڑھ اور بے زبان ہونے کے ساتھ محنتی بہت تھی اور اپنی صفائی پسند طبیعت سے بہت سی چیزوں کی تلافی کر دیتی تھی، لیکن ایک رات بُڈھے پیار کے لمحوں میں اس نے ہونٹ چُرا لیے کیوں کہ سنت رام کے منہ سے سگریٹ کی بو آتی تھی۔ لیکن وہ تو بچپن ہی سے سگریٹ پیتا تھا۔ اب، صدیوں کے بعد یہ بُو کیسی؟ شاید وہ اسی خسارے کی بُو تھی یا شاید دھوبن بوڑھی ہو گئی تھی اور ٹھنڈی اور خشک، کیوں کہ یہ جوانی اور اس کی گرمی ہی ہے جس میں بُو اُڑ جاتی ہے اور روئے زمین کی سب خوشبوئیں پہ چھا جاتی ہے۔ لیکن اگر دھوبن ٹھنڈی اور خشک اور بوڑھی ہو گئی تھی، تو وہ خود بھی تو جوان نہ رہا تھا۔ سنت رام! کیوں اسے اس عمر میں ہونٹوں کی طلب تھی؟ بوڑھے اور بے کیف ہونٹوں کی، جن میں

رس نام کو نہ تھا۔ ان پہ تو صرف جلی کٹی تھیں اور کوسنے، جن کے سوا اور کچھ آ ہی نہ سکتا تھا۔ دھوبن سیدھی سادی اور نادان عورت تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ جب ہونٹ چُرا لیے جائیں تو مرد پہ کیا بیت جاتی ہے؟ سنت رام انہی کی تلاش میں رل کر ان ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ جا رکھتے ہیں، جن پہ سوائے نجاست کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یا شاید دھوبن، سیر بین کی دھوبن پہ 'مینوپاز' چلا آیا تھا اور اس نے پہلو بدل لیا تھا اور یا اپنے سیج سے اُٹھ کر، مور پنکھ کو ہاتھ سے پھینکتی ہوئی، دیکھنے والوں کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ نہ وہ جادو کے ڈبّے والا رہا تھا اور نہ وہ معصوم دیکھنے والے۔ یا خود سنت رام پہ وہ وقت چلا آیا تھا، جب کہ جوانی ایک بار پھر عود کر آتی ہے اور آدمی کئی بار بدنامی سے بال بال بچتا ہے۔ پہلے کی سی طاقت کے ساتھ شعور اور تجربہ بھی شامل ہو جاتے ہیں اور ایک پختگی اور رسیدگی پا جانے سے انسان خود ہی اپنے آپ میں تعفّن پیدا کر لیتا ہے اور تھوڑے پانی والے پوکھر کی کیچ میں بھینس کی طرح لوٹنے لگتا ہے، یا غالباً اس کی وجہ بھی وہی گھاٹا تھی، جو سنت رام نے اپنے کاروبار میں کھایا تھا اور مالی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ پانے کا احساس،

محبت میں غیر محفوظ ہونے کے احساس میں بدل کر رہ گیا تھا۔

لاڈو کی تو خیر کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ تو بیاہی برس گئی اور اپنے گھر جا بسی۔ وہ تو اب 'بابل کے آنگن کی چڑیا' تھی جو کہیں بھولے ہوئے دانوں کو چُنتی ہوئی اُڑ جاتی تھی، لیکن پال تو یہیں تھا اور اسے یہیں رہنا تھا۔۔۔اسی گھر میں، اسی چھت کے تلے، جہاں اُسے بہو کو لانا اور اسے بسانا تھا۔ کہیں اور گھر لے لینے سے تو باپ کے گھر کی چھت نہیں بدلتی۔ وہ کیوں چند باتوں کو نہیں سمجھتا اور یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟ کیوں اس کے پاس اپنے بہن بھائیوں، اپنے ماں باپ کے لیے چند منٹ بھی نہ تھے؟ امریکن فرم میں ایگزیکٹو ہو جانے سے کیا وہ کوئی خدا ہو گیا تھا؟ کیوں وہ اس فرم کے ذریعے سے پرائیویٹ کنٹریکٹ لینے اور یوں پیسہ پیدا کرنے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا۔ وہ کبھی تو باپ سے بات کرتا۔ وہ اس سے پیسے تو نہ مانگتا تھا۔ وہ تو فقط یہی چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پاس بیٹھے۔ وہ تین جسم اکٹھے ہوں، جو ایک دوسرے سے نکلے ہیں۔ بدن، صرف بدن کا لمس ہو۔ یہ نہ بھی ہو تو آنکھیں ملیں، جو باپ ہی پہ نہیں، آبا و اجداد پہ گئی ہیں۔ پاس بیٹھ کر وہ آج کی نئی تعلیم کی باتیں کرے، جس سے پرانے بہت پڑھے لکھے آدمی بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ

ان کی دنیا کا پتہ چلے، کچھ اپنی دنیا انہیں دکھائی جا سکے۔ اس سے سیکھیں اور اسے بتا بھی سکیں کہ صرف تعلیم ہی بس نہیں، تجربہ بھی ضروری ہے اور چند حالات میں جیمز بانڈ کے علم سے بہت اوپر ہوتا ہے۔ وہ کبھی، کچھ تو مانگے اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی سہی۔ کیوں وہ ایکا ایکی اس قدر خود مختار اور بے نیاز ہو گیا تھا؟ یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ بڑا ہو کر، اب ماں باپ پہ کسی قسم کا بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ بوجھ ہی کی بات ہے تو وہ اب بھی بوجھ ہے۔ کیسے کپڑے اُتار کر دھوبن کے سامنے پھینک جاتا ہے اور چونکہ گھر میں کچھ پیسے دیتا ہے اس لیے ماں ماں ہی نہیں رہی، سچ مچ دھوبن ہو گئی؟ گھر میں بیسیوں مہمان آتے جاتے ہیں۔ انہیں ائیر پورٹ سے لینا یا گاڑی پر چھوڑنے جانا، صرف ماں باپ ہی کا فرض ہے؟ اور کچھ نہیں تو لاڈو ہی کو لینے، ملنے چلا جائے۔ وہ اپنی بیٹی ہے تو اس کی بھی بہن ہے۔ اگر پال یہ سب حرکتیں ناسمجھی کے عالم میں کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ تو بلا کا ذہین تھا اور ایک پل میں ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ پار سال جب ایک نہایت امیر باپ کی اکلوتی بیٹی سے اس کا رشتہ ہونے کی بات چلی تو کھٹ سے اس نے انکار کر دیا اور بولا۔۔۔ دس سال مجھے آپ کے چکّر سے نکلنے میں لگے ہیں، پپّا! آپ چاہتے

ہیں میں اور دس سال ایک امیر کی اکلوتی بیٹی کے چکّر سے نکلنے میں گزار دوں؟

کتنے پتے کی بات تھی۔ سنت رام تو اسے سُن کر چکت ہو گیا تھا۔ اسے اس بات کا گورو بھی ہوا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کے ناطے بہت خوددار بھی واقع ہوا ہے اور افسوس بھی۔ افسوس اس لیے کہ باپ کے چکّر سے نکلنے کا مطلب؟ کیا بیٹا باپ کے چکّر سے نکل سکتا ہے، یا باپ بیٹے کے چکّر سے؟ کیا وہ ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ ہو سکنے والا حصّہ نہیں؟ کیا بر اعظموں کا فاصلہ ہونے پہ بھی وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں؟ آخر وہ کون اندھا ہے، جسے وہ دوڑ دکھائی نہیں دیتی جو باپ بیٹے سے وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لیے جدا ہوتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑتا اور چھوڑتا ہی چلا جاتا ہے؟ بیٹا چاہے باپ کے جانے کے بعد یہی کہے کہ میرا باپ نالائق آدمی تھا، ہزاروں کا قرض مجھ پہ چھوڑ کے چلتا بنا۔ اس پہ بھی تعلق تو رہتا ہی ہے نا؟ نالائق باپ اور لائق بیٹے کا تعلق۔ میں تو مر ہی نہیں سکتا، جب تک اپنی اولاد کے لیے کچھ چھوڑ کر نہ جاؤں۔ ایسا ہوا تو ان کی ماں دھوبن تو مجھے وہاں، خدا کے گھر تک نہ چھوڑے گی اور میری روح کا تولیہ تک نچوڑ ڈالے گی۔ لیکن میرے ماں باپ نے میرے لیے کیا چھوڑا تھا؟ اس پہ بھی ان کی عزّت میرے

دل میں کبھی کم نہ ہوئی۔ کیا پیسہ اور جائداد چھوڑنے ہی سے کوئی باپ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے؟ یہ بات تو اعداد و شمار ہی سے غلط ہے۔ ایک باپ مقروض مرتا ہے، جب ہی دوسرا جائداد بنا سکتا ہے نا؟ خیر، میرا تو ابھی تغلق روڈ پر ایک بنگلہ ہے۔ کیا ہوا گھاٹے کے بعد اس پہ تھوڑا پیسہ لے لیا؟ کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس کا رہن بھی نہ چھڑا سکوں؟ پھر گانو جگ دل میں زمین ہے، دو سو بیگھا، جس میں سے کچھ بڑوں کی ہے اور کچھ میں نے اپنے پیسے سے بنائی ہے۔ کیا یہ میری ہمّت نہیں کہ اتنی مصیبت آ پڑنے پہ بھی میں نے اس کا ایک انچ نہیں بیچا؟ میں نے اس لیے نہیں بیچا نا کہ میرے پُرکھوں کی روح کو تکلیف نہ ہو اور میرے بیٹے مجھے کوسنے نہ دیں۔ پھر بیمہ ہے۔ بہت ٹوٹ آئی تو خودکُشی کر کے بیوی بچّوں کو پیسہ دلوا سکتا ہوں۔ جبھی سنت رام کو اپنا باپ یاد آیا اور اس کی موت کا وقت، جس میں صدمے کی انتہا تھی اور اس کے بیچ ایک عجیب سی پُراسرار خوشی بھی کہ اب جو بھی اچھا بُرا کریں گے، اپنا کریں گے۔ اور پال کے سلسلے میں اس بات نے سنت رام کو ایک عجیب طریقے سے مُکت کر دیا۔ آخر کون بیٹا ہے، جو اپنے دماغ کے کسی کونے میں اپنے باپ کی موت کی خواہش لیے نہ

بیٹھا ہو؟

سنت رام کو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ ساتھ کے کمرے میں آ کر اس نے زیرو پاور والا بلب جلایا اور اس کی مدھم سی روشنی میں لاڈو، اس کے بچّے بابی اور پھر پال کا چہرہ دیکھا اور کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ اپنے بیٹے میں جی رہا تھا اور پھر اپنے پوتے، پڑپوتے میں۔۔۔

جبھی سنت رام کو ایک سگریٹ کی طلب ہوئی۔

ارے یار! سگریٹ بھی کیا چیز ہے۔ جس نے بھی اسے ایجاد کیا، حد کر دی۔ کیا ایک ننھّا سا رفیق زندگی کا، جو آپ کے تنہا لمحوں میں کسی دوسرے کے موجود ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے اور اس کے نام سے آپ کبھی اکیلا نہیں محسوس کرتے۔ بلکہ وہ خود زندگی ہے، جس کا ایک کنارہ خود زندگی ہی کی طرح دھیرے دھیرے سلگتا اور دوسرا موت کے منہ یا منہ کی موت میں پڑا ہوتا ہے۔ وہ آپ کی ہر سانس کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوا خود راکھ ہو جاتا ہے، لیکن آپ کے بکھرے ہوئے خیالوں کو ایک نقطے پہ سمیٹ لاتا ہے۔ آپ چند ایسے راز سمجھ چکے ہوتے ہیں، جن کے بعد اور کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ لوگ

کہتے ہیں، اس سے کینسر ہو جاتا ہے۔۔۔ ہوا کرے۔۔۔ جو لوگ سگریٹ نہیں پیتے، وہ کون سی خضر کی حیات جیتے ہیں؟ دنیا کے ہر بشر کو آخر کوئی نہ کوئی بہانہ تو موت کو دینا ہے۔ سگریٹ کا بہانہ کیوں نہ ہو؟

رات جب سنت رام گھر لوٹا تو سگریٹ لانا بھول گیا تھا اور اُس وقت ساڑھے چار بجے دکانیں بند تھیں اور سنت رام کی طلب کھلی جو کھلتی ہی جا رہی تھی۔ سامنے بیٹے پال کے سگریٹوں کا پیکٹ پڑا تھا، جس کے اوپر ماچس رکھی تھی۔ پال شہزادہ ہونے کے کارن اسٹیٹ ایکسپریس سے ادھر سگریٹ ہی نہ پیتا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ، سنت رام کو چار مینار سے لے کر قینچی اور گولڈ فلیک تک سب چلتے تھے۔ اسٹیٹ ایکسپریس پی لوں؟ کیا ضرورت ہے؟ کیا میں چھ ساڑھے چھ بجے تک انتظار نہیں کر سکتا، جب کہ پان بیڑی کی دکانیں کھلنے لگتی ہیں؟ لیکن اگر انتظار کرنے دے تو پھر وہ سگریٹ نہیں، دودھ کا گلاس ہوا۔ سنت رام کا ہاتھ پیکٹ کی طرف لپک گیا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا، پیکٹ میں صرف دو ہی سگریٹ تھے۔ ایک تو باتھ روم کے لیے چاہیے ہی تھا اور دوسرا؟ کیا پتہ ایک سگریٹ سے اس کا کام نہ چلتا ہو اور دوسرے کی بھی ضرورت

محسوس ہو۔ اُس وقت نہیں تو شیو کے بعد سہی۔ یا ناشتے کے بعد۔ اس علاقے میں اسٹیٹ ایکسپریس کہاں ملتے ہیں، جو اڑا لینے کے بعد نو دس بجے سے پہلے چوری چپکے رکھ دیے جائیں، جب کہ پال اُٹھتا تھا۔ رکھ بھی کیسے دیے جائیں، کیوں کہ ان سگریٹوں کے لیے کناٹ پلیس جانا اور آنا پڑتا تھا۔ جس کا مطلب تھا آدھا گیلن پٹرول پھونک دینا۔۔۔ ایک سگریٹ کے لیے! اس سے اچھا ہے کہ چھ ساڑھے چھ بجے تک انتظار کر لیا جائے۔

لیکن صاحب، سگریٹ جب بلاتا ہے تو اتنی زور کی آواز دیتا ہے کہ کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ وہ آواز پینے والوں کو سنائی نہیں دیتی۔ اُن کے کان سُر میں نہیں ہوتے نا۔ کیوں نہ بھیکو، اپنے نوکر سے سگریٹ لے لیا جائے؟ وہ تو بیڑی پیتا ہے۔ بیڑی ہی سہی۔ لیکن بھیکو کو اس کی کمبھ کرن کی نیند سے جگانے کا مطلب تو یہ ہوا کہ پورا پہاڑ کھودو اور پھر اس سے ایک کنکر کی فرمائش کرو، کیوں کہ بھیکو ہمیشہ ہڑبڑا کر، کیا ہوا کیا، کہتا ہوا اُٹھتا تھا، جس سے گھر کے سب لوگ جگ جاتے تھے۔ اس کمینے کی نیند بدعنوانیوں کی وجہ سے کبھی نہ پکتی تھی۔ ارے ہاں باہر چوکیدار بھی تو ہے۔ سنت رام نے دروازہ کھول کر جھانکا اور بتیوں کی

روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ چوکیدار کا کہیں تخم بھی نظر نہ آتا تھا۔ پونے پانچ بجے تھے اور وہ اپنی سمجھ میں پانچ بجا کر، اپنی ڈیوٹی پوری کرتے ہوئے کسی چور کے ساتھ جا سویا تھا۔ بیکار ہی ہم لوگ اسے پیسے دیتے تھے۔ کون سا ڈاکہ پڑنے والا تھا، جب کہ سامنے پولیس کی چوکی تھی؟ بھیکو، چوکیدار یا چوکی کے کسی سنتری سے بیڑی مانگنے سے تو یہی اچھا ہے کہ اپنے بیٹے کا اسٹیٹ ایکسپریس پیا جائے۔ اسے بُرا تو لگے گا مگر جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔۔۔

چنانچہ سنت رام نے پیکٹ اُٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر سُلگایا۔ ایک ہی کش سے سنت رام کا اضطرار آدھا رہ گیا تھا۔ دوسرے کش سے ایک چوتھائی۔ اس حساب سے تو تیسرے چوتھے کش سے پوری تسلّی ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن سگریٹ کا بھی عجیب حساب کتاب ہوتا ہے، جیسے اضطرار کا اپنا لاجک۔ چوتھے کش کے بعد اضطرار کے کم ہونے کی رفتار گھٹ جاتی ہے اور سگریٹ کے جلنے کی زیادہ۔ بہر حال بہت مزہ آیا۔ اسٹیٹ ایکسپریس اتنا اسٹرانگ سگریٹ تو نہیں جتنا چار مینار، مگر اچھا ہے۔

پورا سگریٹ پی چکنے کے بعد سنت رام کو محسوس ہوا کہ اس نے بُرا کیا۔ وہ تھوڑی

دیر کے لیے ایک سگریٹ کے بغیر نہ رہ سکتا تھا؟ نہیں۔ جوانی میں آدمی اپنے حواس پہ قابو رکھ سکتا ہے، بڑھاپے میں نہیں۔ آخر بیٹے کا سگریٹ پیا ہے نا؟ مجھے خوشی ہونی چاہیے اور اگر وہ میرا بیٹا ہے تو اسے بھی کیسا مزا آیا۔ چھوٹی چوری میں بہت مزہ ہوتا ہے۔ جبھی بابی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ ماروں گا، میں تم کو ماروں گا۔ وہ خواب میں کسی سے لڑ رہا تھا؟ لاڈو نے آدھے سوئے، آدھے جاگے عالم میں اسے تھپکنا شروع کیا۔ سوجا بابی، سوجا۔ بابی سو گیا اور وہ بھی سو گئی۔ پال کو کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کے خرّاٹے تو جاچکے تھے۔ البتہ ناک میں کوئی چیز اڑے ہونے کے کارن سیٹی سی بج رہی تھی۔ جبھی اندر سے دھوبن کی آواز آئی۔

"سگریٹ پی رہے ہو؟"

"ہاں۔" سنت رام نے وہیں سے کہا۔

جس کے جواب میں وہ بولی "صبح صبح شروع ہو جاتے ہو۔ دن تو چڑھنے دو۔۔۔ یوں کلیجہ جلانے سے بیمار ہو گے کہ نہیں ہو گے؟

سنت رام نے دل ہی دل میں کہا۔۔۔ میری بیماری کی جیسے بہت پروا ہے۔ یہ گھر

کے لوگ، جب پروا کرنی ہوتی ہے تو نہیں کرتے اور جب نہیں کرنی ہوتی تو کرنے لگتے ہیں۔ اس نے اندر کے کمرے کی طرف منہ کر کے صرف اتنا کہا "تم سو جاؤ، ابھی سوا پانچ ہوئے ہیں۔"

دھوبن کی آواز اس انگڑائی میں چھن کر آئی "نہیں مجھے ہیٹر لگانا ہے، پانی گرم کرنا ہے۔ بہت کپڑوں کا ڈھیر ہے۔۔۔"

جبھی دھوبن کے اُٹھنے کی آواز آئی۔ ہاں صاحب، جب عورتیں اُٹھتی ہیں تو وہ اس بات کا رکھ رکھاؤ نہیں کرتیں کہ کھٹ پٹ سے کوئی ڈسٹرب ہو گا۔ وہ بستر کی چادر کو چھانٹ رہی تھی، جیسے اس پہ کہیں ریت آ پڑی ہو۔ پھر الماری کی کیَں سنائی دی اور اس میں سے دودھ کے لیے پیسے نکلے۔ پھر سینڈل کی کھٹ کھٹ جو برسوں پہلے اچھی لگتی اور دماغ میں فتور پیدا کرتی تھی، اب یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہیں۔

چادر چھانٹتے ہوئے دھوبن کی آواز آئی۔۔۔ "اوف، اوف۔۔۔ دماغ جل گیا ہے، سگریٹ کی بو سے۔"

”اچھا اچھا“ سنت رام نے کہا ”تمھیں بو آتی رہتی ہے۔“

دھوبن کو واقعی بہت بو آتی تھی جو غالباً عمر کا تقاضہ تھا۔ چوتھے کمرے میں کوئی سگریٹ پیے، اسے وہیں سے پتہ چل جاتا تھا۔ ایسے ہی وہسکی شراب کا، چاہے کسی نے صرف چکھا ہی ہوا ہو۔ اس کی کنجوسی، اس کے اخلاقی طور پر اچھا ہونے نے گھر کے سب لوگوں کو چور بنا دیا تھا۔ سب بے حال ہو کر علتیں کرتے اور پھر انھیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے، لیکن دھوبن سے کوئی چھپا نہ سکتا تھا۔ کئی بار ایسا ہی ہوا کہ آپ نے باہر نکل کر، بالکنی پر جا کر سگریٹ سُلگایا، لیکن جب مُڑ کر دیکھا تو دھوبن موجود، جس سے سگریٹ کا مزہ ہی جاتا رہا۔ اس کی اس روک ٹوک نے پال میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اب وہ کھلے بندوں سگریٹ پیتا تھا۔ بلکہ اس نے اسکاچ کی ایک بوتل گھر ہی میں لا رکھی تھی۔ باہر سے آنے پر جب اسے محسوس ہوتا، شراب کم پڑی ہے تو ایک آدھ پیگ گھر ہی میں لگا لیتا۔ ماں سے اس کی کئی بار لڑائی ہوئی تھی۔ دھوبن آخر اس سے ہار گئی تھی۔ اس نے کہا بھی تو اتنا۔۔۔ ”میرا کیا ہے؟ جو آئے گی، اپنی قسمت کو روئے گی۔“

سگریٹ!۔۔۔ دراصل مرد اور عورت کے مرد کی بُو کو ایک ہونا چاہیے، ورنہ

سب تباہ ہو جاتا ہے۔ اس تباہی کے کارن سنت رام نے اپنی ٹائپسٹ ڈولی کو پہلے سگریٹ پلا لیا تھا!

پال اُٹھے گا تو کیا کہے گا؟ یوں ایک سگریٹ پی لینے میں تو کوئی بات نہیں، لیکن کسی عمل، کسی ذائقے کا تکمیل نہ پانا بُرا ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے دو محبت کرنے والوں میں کوئی تیسرا آ جائے۔ پھر پال کئی باتوں میں کس قدر کمینہ ہے۔ ایک بار اس کا جوتا پہن لیا تو وہ کتنا جُز بُز ہوا تھا۔ اس نے جوتے کو یکسر پھینک ہی دیا اور کہنے لگا، میرے اور پپّا کے پیر ایک ہیں کیا؟ اب یہ کھل گیا ہے اور میرے کام کا نہیں۔ سنت رام کو بہت دُکھ ہوا۔ اور ایک بار بیٹے کا جوتا پہن لیا تو کیا ہو گیا؟ بیسیوں بار اس نے میرا چپل پہنا ہے، میں نے تو کچھ نہیں کہا ہے۔ اُلٹا مجھے خوشی ہوئی، اس احساس کے ساتھ، میرے بیٹے نے میرا جوتا پہنا ہے۔ اور بڑوں کا یہ کہن بھی دماغ میں آیا کہ جب باپ کا جوتا بیٹے کو برابر آ جائے تو پھر اسے کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ جب سے میں نے سب کہنا سننا چھوڑ دیا۔ نہیں ایک بار اس نے کسی اسمگلر سے امریکی جرکن خریدی تھی، جو مجھے بہت اچھی لگی۔ پال کو بھی بہت اچھی لگی تھی، جبھی تو اس نے خریدی۔ لیکن، میں ہمیشہ کی طرح اپنے بڑھاپے

کے کارن، اپنے پہننے کے جذبے کو روک نہ سکا۔ چنانچہ میں نے پہن لی۔ اس کے رنگ بڑے شوخ و شنگ تھے اور مجھے اسے پہننے میں بہت مزا آیا۔ لیکن پہلے تو دھوبن نے میرے مزے کو کرکرا کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس دی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ اندر ہی اندر اپنی ہنسی دبائے ہوئے بولی۔ "کچھ نہیں۔۔۔" اور پھر وہ رہ بھی نہ سکی اور کہنے لگی۔۔۔ کیسے گھوم رہے ہو، جیسے دیسی مُرغا مرغی کے گرد گھومتا ہے!"

یہ جذبات کا دھوبی پٹرا تھا۔ خیر۔۔۔

لیکن رہی سہی کسر پال نے ہی پوری کر دی۔ میں نے اپنا شوق پورا کرنے کے بعد اس جرکن کو بڑی احتیاط سے وارڈروب میں ٹانگ دیا۔ لیکن صبح ہی تو پال جرکن کو میرے پاس لے آیا اور بولا۔۔۔ "پپّا! آپ ہی اسے پہن لیجیے۔"

میں نے مجرمانہ انداز سے کہا "کیوں۔۔۔ تم کیوں نہیں پہنتے؟"

"یہ میرے کام کا نہیں رہا۔" وہ بولا "دیکھتے نہیں آپ کا پیٹ بڑا ہے۔ آپ کے

پہننے سے الاسٹک چلا گیا ہے، اس کا۔"

مجھے بے حد غصّہ آیا اور میں اس پہ برس پڑا۔ میں نے کہا، میں تمھارا باپ ہوں۔ جرکن پہن لی اور تمھارا نقصان کر دیا؟ تم نے سیکڑوں نہیں ہزاروں بار میرا نقصان کیا ہے۔ میں نے کبھی تمھیں کچھ کہا ہے؟ اُلٹا میں خوش ہوا ہوں۔ چلو یوں کہہ لو کہ باہر سے ناراضی کا ثبوت دیا ہے لیکن اندر سے میں کتنا خوش تھا؟ تم سیکڑوں بار میری قمیص، میرا جوتا پہن گئے ہو۔ میں نے یہی کہا۔۔۔ "میرا بیٹا، میرے کپڑے پہنتا ہے اور تم نے اسی طرح اس دن تین گھوڑے والی بوسکی قمیص میرے منہ پہ دے ماری۔ تم نہایت کمینے، نہایت بے شرم آدمی ہو۔

بجائے اس کے کہ پال کو افسوس ہو، وہ میرے ساتھ دلیل بازی پر اُتر آیا۔ "آپ پان کھاتے ہیں" وہ کہنے لگا۔ "اور اس کا کوئی نہ کوئی چھینٹا اس پہ پڑ جاتا ہے۔ کیا وہ قمیص پھر میرے پہننے کے لائق رہتی ہے؟"

ان دنوں بھی لاڈو یہاں، اپنے مائیکے آئی ہوئی تھی۔ اس جھگڑے میں وہ بھی پاس آ کھڑی ہوئی اور بول اُٹھی "پپّا بالکل میری طرح ہیں۔۔۔"

اِن دنوں چھوٹے دونوں بھی، جو اس وقت اپنے ماموں کے ہاں گڑ گاؤں گئے ہوئے تھے، یہیں تھے۔ چھٹکی بھیکو کی مدد سے بستر کی سلوٹیں نکالتی ہوئی بولی۔۔۔ ”ہاں! بات کرتے ہیں تو لاڈو دیدی کی طرح منہ کی ساری پھوار سامنے والے پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ تماشا اس وقت ہوتا ہے جب کہیں پپّا اور لاڈو آپس میں بات کر رہے ہوں، تو۔“

لاڈو ہنس رہی تھی۔ دوسرے سب سن رہے تھے۔ نہ چاہنے کے باوجود میرے چہرے پہ بھی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔ بات سنجیدہ رہی تھی اور نہ مضحک۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا بھی تو اتنا۔۔۔ ”ہاں آخر لاڈو کا باپ ہوں نا، اس پہ گیا ہوں۔“

اور تو اور، چھوٹا من بھی ہنس رہا تھا، نجلیوں کی طرح۔ پھیپھڑے پیدائشی طور پر کمزور ہونے کے کارن وہ کبھی کھل کے نہ ہنسا۔۔۔ ”ہی ہی، پان کھاتے ہیں نا پپّا“ اس نے کہا ”تو قمیص پہ سامنے تو لگتا ہی ہے، لیکن پیٹھ پہ نہ جانے کیسے لگتا ہے؟“ یہ سب سمجھتے تھے، میں پان منہ سے تو کھاتا ہی نہیں، قمیص سے کھاتا ہوں۔ اس پہ طرفہ دھوبن منظر پہ چلی آئی۔ میرا خیال تھا، ماں ہونے کے ناطے وہ باپ کا پکش

لے گی، لیکن صاحب، اِس نے اُلٹا بیٹے بیٹیوں کی تائید شروع کر دی۔ ”کیا پوچھتے ہو ان کا؟“ وہ بولی۔۔۔ ”بالکل بابی ہیں دوسرے۔ کھانا کھائیں گے تو سالن کُرتے پہ گرا ہو گا، لکھنے بیٹھیں گے تو سیاہی۔ میں ان کا کروں کیا؟ پتہ تو مجھے چلتا ہے نا، دھوتے دھوتے جس کے ہاتھ رہ جاتے ہیں، پر میری قسمت۔ عمر گزر گئی میری، ان کے داغ نکالتے نکالتے۔۔۔“

صرف ایک بابی رہ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بانس تھا، جس سے وہ ”بڈھا بابا“ کو بھگا رہا تھا ”ماروں گا“ وہ خلا میں خیالی دشمن کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا بڈھا بابا، اس کا خیالی دشمن میں ہوں۔ پھر جمّی کے بھونکنے کی آواز آئی، جسے آپ اتفاقیہ بات کہہ لیجیے۔ بھیکو بجلی کا بل چکانے چلا گیا تھا، ورنہ وہ اپنی مکھی بولی میں کہتا ”ہم میاں بی بی کا جھگڑا میں ناہیں پریو“ اور یہ بات اور بھی میرے خلاف ہو جاتی۔ گھر بھر میرا دشمن ہو گیا تھا۔ ایسا پہلے تو نہ تھا، چند برس پہلے۔ جب سے مجھے کاروبار میں گھاٹا پڑا ہے، دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کسی کو میری بات ہی پسند نہیں۔ یا شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اس لیے سب کو بُرا لگتا ہوں۔ مجھے ان کے سامنے ٹل جانا چاہیے۔ اس دنیا سے ٹل جانا

چاہیے لیکن میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ میں نے اس گھر، ان لوگوں پہ اپنی جان بھی وار دی۔ نہ کسی کلب کا ممبر ہوا، نہ ریس کورس پہ گیا۔ یہ تو یہ، کوئی پکچر بھی ڈھب سے نہ دیکھی۔ کام، کام اور کام۔ تفریح کے لیے ایک لمحہ نہیں۔ اسی لیے میں ذہنی طور پر بیمار ہو گیا ہوں۔ شاید پاگل۔ پاگل نہیں تو سنکی ضرور ہوں۔ کبھی پاگل، یا سنکی کو پتہ چلا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اسے تو صرف دوسرے جانتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی شکلوں سے اپنی شکل کا پتہ چلتا ہے۔ نہیں، یہ بات نہیں۔ خدا، کسی کو خسارہ نہ ہو۔ جوانی میں جو ہونا ہے ہو جائے، لیکن اس ڈھلتی عمر میں نہیں، جب کہ مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بچّوں کا فادر امیج گڑبڑ ہو جاتا ہے، اور بیوی کا بھی۔۔۔

پال آٹھ بجے اُٹھ گیا تھا۔ اسے اُٹھتے دیکھ کر سنت رام سنسنا گیا۔ ڈرنے کی ایک نشانی یہ ہے کہ آدمی سامنے یا دل میں کہنے لگے، میں کسی سے ڈرتا ہوں؟ سنت رام پہ اچھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ڈرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا، معاملے کو اس سطح پر لے آئے، جس سے بیٹا یہ کہے کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ پال تو چاہتا تھا ایسا موقع پیدا ہو۔۔۔ کوئی سُنے تو ہنسے۔ بیٹے کا ایک،

صرف ایک سگریٹ پی لینے سے اتنا ڈر اور اتنی ذہنی بک بک؟

چائے سے پہلے پال نے باپ کی طرف دیکھا اور معمول کی نمسکار کی، جس کے جواب میں سنت رام نے سر ہلا دیا اور اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پال دوسری طرف دیکھے تو وہ اس کی طرف تکے۔ لیکن پال نے برابر اپنا منہ باپ کی طرف کر رکھا تھا، جس سے گھبرا کر سنت رام نے اپنا چہرہ "ہندوستان ٹائمز" کے پیچھے چھپا لیا۔ پھر اسے تھوڑا ہٹا کر دیکھا تو پال سُڑک سُڑک چائے پی رہا تھا، جس کے بعد اس نے کھٹ سے پیالی پرچ میں رکھی۔ پھر وہ سگریٹ کا پیکٹ تھامے باتھ روم کی طرف نکل گیا۔

اب تک تو سب ٹھیک تھا۔ پال نے پیکٹ کھول کر نہیں دیکھا تھا نا۔ جب وہ باتھ روم جائے گا، تب اسے پتہ چلے گا۔ اور سنت رام بیٹے کے باہر آنے اور اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے یوں ہی اِدھر اُدھر ہوتا رہا۔ دھوبن نے کہا۔۔۔ نہاؤ گے نہیں؟ تو جواب میں جھلاتے ہوئے سنت رام نے جواب دیا۔۔۔ تمھیں نہانے کی پڑی ہے۔ ایک ہی بار نہاؤں گا۔

دھوبن حیرانی سے سنت رام کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کی ہنکار کو

معمول کی لایعنی سمجھ کر ناشتے کے دھندے میں مشغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں پال باتھ روم سے آیا تو اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ ماتھا کچھ اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ واش بیسن میں جلدی جلدی اپنے ہاتھ صابن سے دھو رہا تھا۔ اتنی جلدی کیا تھی؟ کیوں وہ جلدی بھاگ جانا چاہتا تھا؟ سامنے اس نے آئینے میں اپنے چہرے کی طرف دیکھا۔ منہ سے جھاگ لپٹ رہے تھے۔ نہیں، ہاتھ دھوتے ہوئے جھاگ اُڑ کر چہرے پہ چلے آئے تھے۔ چونکہ ابھی صابن سے اَٹے تھے، اس لیے اس نے کُرتے کے بازو سے جھاگ کو پونچھ دیا اور پھر اپنا چہرہ دیکھنے لگا، اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر نتھنے پھُلانا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر نہیں۔ ہاتھ دھوتے ہوئے پال لوٹا تو دھوبن نے آواز دی۔۔۔ ”رات تم پھر پی کر آئے تھے؟“

پال نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اتنا کہا ”ہاں، آج پھر پینے والا ہوں۔“

دھوبن تن گئی۔ وہ ایسی دبنے والی تھوڑی تھی؟ اس نے صاف کہہ دیا۔۔۔ آج پی کر آئے تو میں دروازے میں قدم نہ رکھنے دوں گی، جس کے جواب میں پال نے کہا۔۔۔ ”آنا کون چاہتا ہے، اس جیل خانے میں؟ میں نے پہلے ہی گولف لنکس

میں ایک کمرہ دیکھا ہے۔" پھر دھوبن کی پائیدار آواز آئی۔ نکل جاؤ ابھی نکل جاؤ، جس سے سنت رام کی جان نکل گئی۔

"دیبی" سنت رام نے کڑک کر کہا "کیا کہتی ہو، یہ گھر تمھارا ہے؟"

اسی پنچم میں دھوبن نے جواب دیا "ہاں میرا ہے، جانا ہے تو جائے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو تو جاؤ، بھلا ہو تم باپ بیٹوں کا، جنھوں نے جینا سکھا دیا" اور پھر وہ رونے لگی۔۔۔

سنت رام اسی بات سے تو ڈرتا آیا تھا کہ ایسا موقع نہ آئے۔ بیٹے کی بدعنوانیوں کو دیکھ دیکھ کر وہ اندر سے کڑھتا رہتا تھا، لیکن باہر سے کچھ نہ کہتا تھا۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہوتا ہے، چلے جاؤ، مگر پھر واپس آجاؤ کہنا مشکل۔ پال کے باقی کام کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی شیو بنا رہا تھا اور اپنی ٹھوڑی پر بے شمار قط لگا رہا تھا اور خون پونچھ رہا تھا۔ اس نے ماں کو ایسا جواب کیوں دیا؟ وہ ماں کو اُلٹی سیدھی کہتا تھا، تو سنت رام کو تکلیف ہوتی تھی اور ماں اسے کچھ کہتی، تو اذیّت۔ لیکن ماں بیٹے کا رشتہ زیادہ قدرتی تھا، جس سے وہ ایک دوسرے کو سُن سُنا کر پھر ایک ہو جاتے تھے، مگر آج پال کا انداز یہی تھا کہ وہ جائے گا تو پھر نہیں آئے گا۔۔۔

”آنا کون چاہتا ہے، اس جیل خانے میں؟“۔۔۔اس کا کیا مطلب۔ پال کچھ نہیں کہہ رہا تھا، لیکن اندر سے محسوس کر رہا تھا کہ اس گھر میں آنے کا کیا فائدہ، جہاں کوئی چیز اپنی نہ رہ سکے۔ جوتا، نہ جرکن اور نہ سگریٹ۔ پھر پال جلدی جلدی نہایا، اور کپڑے پہنتے ہوئے باپ کے پاس سے گزر گیا۔ سنت رام نے اسے بلانے کی کوشش کی، لیکن اس نے آناکانی کر دی۔ اخبار بھی اُٹھا کر نہ دیکھا اس نے، اور اسٹیٹ ایکسپریس کا سگریٹ پوری نفرت سے کھڑکی کے باہر پھینکتا ہوا وہ نکلنے لگا۔ دھوبن تو اس سے لڑ بیٹھی تھی، اس لیے اس نے بیٹے کو ناشتے کے لیے بھی نہ پوچھا۔ سنت رام نے اسے روکنے کی کوشش کی اور آواز دی۔۔۔ ”بیٹا ناشتہ تو کر لو۔“

”نہیں“ پال نے مصمّم جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ جس انداز سے اس نے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا تھا، اس سے روح تک میں تشنّج پیدا ہو گیا۔

پال کے جاتے ہی دھوبن اور سنت رام میں ٹھن گئی۔ وہ تو اسے صرف اس فضیحتے کے سلسلے میں مطعون کر رہا تھا، لیکن دھوبن ایک طرف روئے جا رہی تھی اور دوسری طرف کوسنے دے رہی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ نئے پُرانے سب دفتر

کھول بیٹھی۔ اس کی باتوں سے تو ایسا پتہ چلتا تھا کہ اس گھر میں آ کر اس نے کبھی کوئی سکھ ہی نہیں دیکھا۔ وہ بہت پھوٹی قسمت والی تھی، حالانکہ سنت رام سمجھتا تھا کہ اس دنیا کا کوئی سکھ نہیں جو اس نے بیوی کو نہ دیا ہو۔ اور اگر دُکھ ہی دیکھا ہے تو ساتھ اس نے بھی تو دیکھا ہو۔ لیکن، بیوی نہ صرف اپنے بلکہ پوری اولاد کو تباہ و برباد کرنے کا ذمہ دار سنت رام کو ٹھہرا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، پہلے یتیم بھائی بہنوں کے سلسلے میں مجھے ڈانٹتے، لڑتے جھگڑتے رہے میرے ساتھ۔ پھر دوست مجھ پر لاد دیے۔ ایک ہاتھ سے بچّہ کھلا رہی ہوں اور دوسرے سے روٹیاں پکا رہی ہوں ان بڑ کٹوں کے لیے۔ اب قصائی اولاد کے حوالے کر دیا۔ اتنی چھوٹ دے دی، پیسے کپڑے کی، جس سے وہ نالائق نکل آئے سب کے سب۔ اور اب بیٹے کی یہ ہمّت کہ وہ تمہارے ہوتے سوتے مجھے آنکھیں دکھائے۔

سنت رام حملے کے بجائے مدافعت پہ اُتر آیا۔ واقعی وہ کیا تھا جو بیوی کو بچّوں سے نہ بچا سکتا تھا اور نہ بچّوں کو بیوی سے۔ جب تک لاڈو بھی جگ گئی اور آنکھیں پونچھتے ہوئے منظر کو دیکھنے لگی۔ کاش وہ تھوڑی دیر پہلے اُٹھ جاتی اور اپنے بھائی کو جانے سے روک لیتی۔ وہ میرا بیٹا ہے تو اس کا بھی تو بھائی ہے۔ لیکن ماں کو روتے دیکھ کر

وہ اس کی طرف ہو گئی۔ بظاہر اس نے ماں ہی کو چُپ کرنے کے لیے کہا اور سنت رام کی طرف دیکھا صرف۔ لیکن اس کے دیکھنے ہی میں کیا کچھ نہ تھا، جس سے سنت رام کے اور بھی اوسان خطا ہو گئے۔ اور اس کے بعد وہ بچّے کو سنبھالنے لگی اور گھر میں اپنے میاں کو ٹیلیفون کرنے تا کہ وہ آئے اور اسے لے جائے۔ اس کے بعد ایک خاموشی سی چھا گئی، جس میں دھوبن کے سسکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ یہ خاموشی۔۔۔ لاڈو اور دوسرے بچّوں نے بھی تو یہ سمجھ لیا تھا کہ روز کا معاملہ ہے، کون اس پہ سر دھُنے؟ یہ کیا میرا ہی معاملہ تھا؟ سنت رام نے سوچا۔ گھر کے کسی اور بشر کا نہیں؟ پال تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔ ماں کے بات کرنے سے پہلے۔ دھوبن کی بات تو صرف ایک بہانہ ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا پال کو کوئی سا بھی بہانہ دے، لیکن اس نے نہیں تو اس کی ماں نے اسے دے دیا۔ کیونکہ وہ جل بھن گیا تھا۔ پیکٹ میں صرف ایک ہی سگریٹ پا کر۔۔۔

سنت رام دفتر میں داخل ہوا تو اس نے کسی کے علیک سلیک کا جواب نہ دیا۔ لیکن ان لوگوں کو کیا پروا تھی؟ آج صاحب کا موڈ اچھا نہیں، کسی نے کہا۔ پھر، دوسری طرف سے آواز آئی۔ اچھا کب ہوتا ہے؟

کیبن میں داخل ہوتے ہی چپراسی چندو سے سنت رام نے سگریٹ کا پیکٹ منگوایا۔ چندو ہمیشہ پہلے ہی سگریٹ خرید کر رکھتا تھا۔ وہ اپنی جیب سے دام خرچ کر دیتا اور جب مالک سے مل جاتے تو جیب میں ڈال لیتا۔ سنت رام نے اپنا کوٹ ٹانگا۔ پیکٹ پر سے کاغذ پھاڑا، سگریٹ نکالا، سُلگایا اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ لیکن آج سنت رام کا جی کام میں نہ تھا۔ ایک شدید ڈر نے اس کے جسم و ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے گھومنے والی کرسی پہ پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ٹانگیں میز پر رکھیں اور سگریٹ کے دو چار لمبے لمبے کش لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔ میں نے کیسے تباہ کر دیا ہے، گھر کے لوگوں کو؟ بیوی اور بچّوں کو؟ میں معمّر ہونے کے باوجود پڑھتے رہنے کی وجہ سے آج کل کے زمانے کا ہوں۔ میں نے شوہر اور باپ بننے کی بجائے، ان سے دوستی رکھنے کی کوشش کی۔ شاید یہی قصور تو نہیں میرا؟ میں نے ایسی باتیں کیں جو پرانے خیال کے باپ نہیں کرتے۔ جب وہ کالج جا رہی تھی تو میں نے کہا تھا۔۔۔ وہاں مخلوط تعلیم ہے لاڈو۔ وہاں لڑکیاں بھی ہوں گی اور لڑکے بھی۔ اور لڑکے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ آج کل ہماری معاشرت میں ایک نئی چیز آ گئی ہے جسے گڈ ٹائم کہتے ہیں۔ گڈ ٹائم ہے، لیکن مرد اور عورت میں جو بنیادی فرق

ہے، اسے تم مت بھولنا۔ مرد پہ کوئی ذمہ داری نہیں بشرطِ کہ وہ اپنے اخلاق، اپنی تہذیب سے اُسے قبول نہ کرے، لیکن عورت پہ بہت ہے کیوں کہ بچّہ اُسے اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی لیے دنیا بھر میں عورتیں نہ صرف قدامت پرست ہیں بلکہ ان سے تقاضہ کیا جاتا ہے، قدامت پرستی کا۔ اور یہ ٹھیک ہے، انہیں کبھی اپنے آپ کو ایسے مرد کے حوالے نہیں کرنا چاہیے، جو اس کی اور اس کے بچّوں کی ذمے داری قبول نہ کرے۔

دھوئیں کے مرغولے میں سنت رام کو اس وقت کا بیٹی کا چہرہ یاد آیا۔ وہ بِڑ بڑ باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ رہی تھی اور کچھ بھی نہیں۔ شاید وہ سوچتی تھی۔۔۔پپّا یہ آج کیا لے بیٹھے ہیں؟ اِس بات کو آج کل کے زمانے کی ہر عورت، ہر لڑکی سمجھتی ہے۔پپّا کتنے پرانے خیالات کے ہیں؟ اگر میں پرانے خیالات کا ہوں تو روز یہ قصّے کیا سنتا ہوں؟ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو بدھ کے زمانے میں بھی کہی جانی چاہیے تھی۔ اور آج کے زمانے میں بھی۔ کیا انسان مشق اور غلطی ہی سے سیکھتا ہے؟ لیکن اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ جہاں اس محلّے کے دوسرے بچّوں نے بدعنوانیاں کیں، وہاں میرے بچّوں نے نہیں۔ کم از کم لڑکیوں نے نہیں۔

یہ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا جو میں نے انہیں دی، تو پھر یہ تباہی کیسی؟ پال پچیس برس کا ہو گیا تھا جب میں نے براہ راست اس سے پوچھا کہ اسے عورت کے سلسلے میں کوئی تجربہ ہوا ہے؟ چونکہ وہ بیٹا ہونے کے علاوہ میرا دوست تھا، اس نے سب کچھ کہہ دیا۔ اب مجھے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ وہ تجربہ کامیاب ہوا یا نہیں کیونکہ جنسی فعل ایک بہت بڑی ذمّے داری کی چیز ہے۔ اس میں کوئی سی بھی غلطی پوری زندگی پر چھا سکتی ہے۔ اسی لیے تو مرد عورت کے بیچ صحبت اور شادی کی چار دیواری کا تحفظ لازمی ہے۔ لیکن پال بھی میری طرف بڑ بڑ دیکھ رہا تھا اور شاید جی ہی جی میں ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔۔۔ ہونہہ! ذمّے داری!۔۔۔ پپّا انیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکن یہ طے تھا کہ بہت سی باتیں وہ نہ جانتا تھا اور میں نے اس کے دماغی جالے اور پھپھوند اتار دیں اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ دنیا اور اس کے حالات کا مقابلہ کر سکے، اور آج اس بیٹے نے، اس کا ایک سگریٹ پی جانے سے منھ موڑ لیا مجھ سے!

نہیں، ہو سکتا ہے معمول کی طرح وہ کسی اپنی ہی دُھن میں ہو اور جلدی گھر سے باہر نکل گیا ہو۔ فرق یہی ہے نا کہ پہلے وہ دس کے قریب جاتا تھا اور آج ساڑھے

نو بجے نکل گیا تھا۔۔۔ کل میری ایک فرم سے لاکھ روپے کی ڈیل ہونے والی ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر پال خفا بھی ہو گیا ہے، تو راضی ہو جائے گا۔ پھر سب مل کر کلّو کے پہاڑ پر جانے کا پروگرام بنائیں گے۔

لیکن، ایک سگریٹ۔۔۔ صرف ایک سگریٹ۔۔۔

سنت رام کا خون بار بار کھول اُٹھتا تھا، جیسے اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا ہو، خود کو معاف نہ کیا ہو۔ مگر جو باپ، بیٹے سے نفرت کرتا ہے، اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے، تو اُس کا اُلٹ بھی درست ہے کہ جو بیٹا باپ سے نفرت کرتا ہے وہ اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے۔ پال دراصل باپ سے نفرت نہیں کرتا تھا، خود سے نفرت کرتا تھا کیونکہ مقابلے کی اس دنیا میں جب تک وہ باپ سے آگے نہیں نکل جائے گا، خود کو معاف نہیں کرے گا وہ باپ سے محبت اس وقت کر سکے گا، جب وہ اسے نالائق اور بے وقوف ثابت کر دے۔۔۔

سنت رام نے گھنٹی پہ ہاتھ مارا اور چندو سے کہا۔۔۔ ”مس ڈولی کو بلاؤ۔“

ڈولی اندر آئی۔ آج اس نے بالوں کے پرم بنوا رکھے تھے اور چُست بلاؤز کے

ساتھ ایک سفید رنگ کی ساری لپیٹ رکھی تھی، کیونکہ سنت رام کو سفید رنگ بہت پسند تھا۔ لیکن سنت رام نے ڈھب سے اس کی طرف نہ دیکھا۔ ڈولی جانتی تھی، آج کل بوس کٹا کٹا سا رہتا ہے۔ اس نے بھی دنوں سے بزنس کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ یہ تو اس کا کرم تھا کہ ایک بُڈھے آدمی سے باتیں کرتی تھی۔ وہ کام کرتی تو پیسے لیتی تھی۔ بیچ میں وافر باتیں کیسی؟

اندر آنے کے بعد جب ڈولی نے 'یس سر' کہا تو سنت رام نے چھچھلتی ہوئی نظر اس پہ ڈالی اور اپنے آپ کو کہنے سے روک لیا کہ تم بہت خوبصورت لگتی ہو، ڈولی!

لیکن، ایک لمحے کے لیے اس کا دل جو کہیں بھی چھٹکارا پانے کے لیے تڑپ رہا تھا، ڈولی کے خوبصورت بالوں میں اٹک گیا۔ یہ عورتیں بھی خوب ہیں۔ اگر مرد کا دل سیدھے بہاؤ میں نہ بہے، تو اُسے لہروں اور اُس کے ہچکولوں میں ڈبو دو۔ مگر سنت رام نے جلد ہی اپنی آنکھیں اس طوفانی بہاؤ اور پیچھے کے بھنور سے ہٹا لیں اور دائیں طرف درکشاسو کے کیلنڈر کو دیکھنے لگا، جیسے اسے کوئی تاریخ دیکھنا ہو۔ ایسی حرکتوں کو عورت خوب سمجھتی ہے اور اپنی نظریں اپنے شکار پر گاڑے رہتی ہے۔ مرد جانتا ہے کہ اس نے عورت کی آنکھوں میں دیکھا تو گیا، اس لیے وہ

پرے سے اور پرے سے پرے دیکھنے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کب تک؟ آخر منٹ کے سوویں حصّے کے لیے وہ مجبوری اور بے اختیاری کے عالم میں پھر اس کی طرف دیکھ لیتا ہے اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی آخری پھڑ پھڑاہٹ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

سنت رام نے ڈولی سے پوچھا۔۔ "پر کنز کہاں ہے آج کل؟"

۔۔۔پر کنز ڈولی کا بھائی تھا، جاہن پر کنز۔

"یہیں ہے" ڈولی نے جواب دیا اور تھوڑا مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سنت رام کے اس سوال کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں سے سمجھتی تھی، جو مطلب پہ آنے سے پہلے مرد ہمیشہ کرتا ہے۔ لیکن وہ تو سخت بزنس کا عمل جاری رکھنا چاہتی تھی۔ آخر کوئی مذاق ہے؟ جب چاہے بلالو۔ جب چاہے جھٹک دو، اتنے دنوں تک بات بھی نہ کی۔ دیکھا تک نہیں اور گزر گئے اور آج ایکاایکی پر کنز یاد آیا ہے!

لیکن ڈولی بھی کب تک بزنس کا انداز رکھ سکتی تھی۔

سنت رام نے ڈولی کو نادانی کے عالم میں سگریٹ پیش کر دیا۔ ایک لہر سی ڈولی کے

بدن میں دوڑ گئی جو اس کے بالوں کے پرم سے زیادہ مُضطرب تھی۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھ روک دیے اور بولی "نو تھینکس" اور پھر غصّے اور شکایت سے اس کی چھاتیاں اوپر نیچے ہونے لگیں۔ سنت رام نے اس کی نظروں میں اپنی نظریں گاڑتے ہوئے ایک رونے سے انداز میں کہا۔۔۔ "ڈولی۔۔۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سنت رام کہنے جا رہا ہے۔۔۔ دنیا نے میرے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ گھر کے لوگوں نے کیا ہے۔ ایک تم تھیں جو ایک معمولی سے 'ریز' کے لیے مجھے التفات کا دھوکا دے سکتی تھیں اور تم نے دھوکا دیا اور وہ مجھے ایسی محبت کی جو سچّی محبت سے کہیں اوپر ہوتی ہے۔ اس میں وہ فرق تھا جو اصلی بوسے اور چوری کے بوسے میں فرق ہوتا ہے۔ جس میں پچھلا لاکھ روپے کا گھاٹا اور آنے والا لاکھ روپے کا نفع بڑے خوبصورت طریقے سے ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں۔۔۔ ڈولی نے سنت رام کی طرف دیکھا، ورنہ وہ اور بھی بوڑھا ہو جاتا اور اسے ایک کی جگہ کئی اور گھاٹے پڑ جاتے، جن سے وہ خود بھی بے کار ہو جاتی۔ اس نے اپنے رحم کی تہوں سے سوچا، جو اس کی ماں تھا، اور دنیا بھر کے مردوں کی ماں، چاہے وہ جوان ہوں یا بوڑھے پھر 'آل رائیٹ' کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ

سگریٹ کی طرف بڑھایا۔ سنت رام نے لائیٹر جلا کر ڈولی کا سگریٹ سلگایا۔ ڈولی نے کش لگا کر، دھواں چھوڑتے ہوئے ایسی ہی سگریٹ کی طرف دیکھتی ہوئی سنت رام کی طرف بڑھی۔۔۔

جبھی سنت رام نے کہا" پر کنز شہر میں ہے تو اسے کہو۔۔۔"

ڈولی وہیں رُک گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی تاکہ وہ اپنا فقرہ مکمل کر لے۔۔۔ سنت رام نے کہا۔۔۔ "مجھے اسٹیٹ ایکسپریس کا ایک کارٹن لا دے، پیسے پھر دے دوں گا۔"

"آل رائیٹ" ڈولی نے کہا اور پیچھے ہٹتی ہوئی وہ کیبن سے باہر نکل گئی۔

سنت رام گھر پہنچا تو کارٹن کی قلعہ بندی کے باوجود وہ دوڑ رہا تھا۔ ایک نہیں، بیسیوں واہمے دامن گیر تھے، اس کے، جن کے بارے میں وہ دھوبن یا لاڈو سے نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی پال چلا آیا۔ سنت رام کے بدن میں جو کپکپی پیدا ہو رہی تھی، بند ہو گئی۔ بلکہ ایک عجیب طرح کے سکون، نرمی اور گرمی کا احساس ہوا اُسے، جیسے سردیوں میں کوئی کمرے کے اندر بخاری

جلا دے، لیکن پھر وہی ڈر اس کے جسم و ذہن کا احاطہ کرنے لگا۔۔۔ کہیں اپنے کپڑے لتّے اٹھانے اور گولف لنکس کے کمرے میں منتقل ہو جانے کے لیے تو نہیں آیا، پال؟ مگر اس بات کے تو کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ پھر وہ آج جلدی کیوں چلا آیا تھا؟ وہ تو کبھی نہ لوٹا تھارات کے ایک دو بجے سے پہلے!

کیا وہ اچھا بیٹا ہو گیا تھا؟ لیکن اچھا بیٹا ہونے کے باوجود وہ چُپ کیوں تھا؟ وہ لاڈو کے ساتھ بات کر سکتا تھا۔ اور نہیں تو بالی کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ کمینہ، کس قدر بغض سے بھرا ہوا تھا اس کا سینہ۔ لیکن پال نے کوئی کپڑے وپڑے اکٹھے نہ کیے۔ وہ ایک منٹ کے لیے اپنے کمرے کی طرف گیا اور پھر باپ کی طرف آیا اور جیب میں سے ایک پیکٹ نکال کر پپّا کو پیش کر دیا۔ سنت رام نے دیکھا اور پوچھا۔۔۔ ”یہ کیا ہے؟“

”رشین سوبرائن۔“

رشین سوبرائین سگریٹ۔۔۔ اور پورا پیکٹ؟ خون سنت رام کے کانوں اور آنکھوں تک آنے لگا۔۔۔ ایک سگریٹ تو کیا پی لیا ہے اس کا۔ اس کے عوض پورا پیکٹ لا کے دے رہا ہے۔ جوتا مار رہا ہے۔ ایک طریقے سے سنت رام نے پیکٹ

اٹھایااور پورے زور سے پال کے منہ پر کھینچ مارا۔

"لیجیّ، شہدے، حرامی" سنت رام کہہ رہا تھا "تو کیا سمجھتا ہے، میں اپنے سگریٹ بھی خرید نہیں سکتا؟ تجھے خرید کر نہیں دے سکتا؟ اتنا تو نہیں مرا ہوں، جتنا تو سمجھتا ہے۔ ابھی تو تیرے ایسے سو کمینوں کو خرید کے رکھ لوں اور جیب میں ڈال کے چل دوں۔۔۔ باسٹرڈ!"

پال کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہونٹ پہ رکھ لیا، جس پہ پیکٹ کے لگنے سے ایک کٹ سا چلا آیا تھا اور خون کا ایک نقطہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کہا بھی تو صرف اتنا۔۔۔ "پپّا!"

لاڈو بیڈ روم سے دوڑی ہوئی آئی اور اس نے بھی اتنا سا کہا۔۔۔ "پپّا!" پھر دھوبن مڑتی ہوئی بولی۔۔۔ "کیا ہوا جی؟"

"کچھ نہیں۔" سنت رام نے سب کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "مجھے اس بلّے سے اپنا حساب برابر کر لینے دو۔ بہت دیر ہو گئی اسے ٹھُکے ہوئے۔۔۔" پھر اپنے بیٹے کے چہرے پہ خون کا قطرہ دیکھ کر سنت رام اور ڈر گیا، اور بھی وحشت ناک ہو گیا

کیوں کہ بیٹے کا خون دیکھنا کوئی آسان بات نہیں۔ دیکھنے والے کو بظاہر وہ بیٹے کا خون معلوم ہوتا ہے لیکن خون اس کا ہوتا ہے، جس کا وہ خون ہے۔۔۔ اور بھی آگے لپکتے ہوئے منہ پہ کف لاتے ہوئے سنت رام کہہ رہا تھا۔۔۔ ”میں تجھے جان سے مار دوں گا، آج۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو مجھے۔۔۔ یہ بھی ایک مثال ہو جانے دو۔ مادر۔۔۔ میں نے تجھے کیا نہیں دیا؟ تو باہر پنجاب پڑھنے کے لیے گیا تو چار سو روپے مہینہ بھیجتا رہا۔ پھر تو وہاں سے بھاگ آیا اور میرے دوست نے دو برس تجھے اپنے ہاں رکھا اور تجھے تعلیم دی۔ میری وجہ سے اس نے تجھے اپنے ہاں رکھا، ورنہ تجھے کون پوچھتا ہے۔۔۔ چیتھڑے کو؟ اور پھر بھی پیسے بھیجتا رہا۔ میرے بیٹے کو تکلیف نہ ہو۔ اور تو اس سے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جاتا، ہر قسم کی بد معاشیاں کرتا رہا۔ تیرے اپنے بکنے کے مطابق تیرے دوست تجھے شہزادہ کہتے تھے، کیوں کہ تو باپ کے مال پہ عیش کرتا تھا۔ پھر تو نے بی۔ اے میں کمپارٹمنٹ کی اور امتحان کو پورا نہ کیا، کیوں کہ تو ہندی میں فیل ہو گیا تھا۔ ہندی بھی کوئی بات تھی بھلا؟ میں نے کتنی بار تجھ سے منّتیں کیں کہ ایک مضمون ہے، پاس کر لے لیکن تجھے اس سے چڑ ہو گئی۔ پھر بھی میں نے تجھے گھر رکھا اور روٹیاں کھلاتا رہا۔ ہوتا کسی

باہر کے ملک میں تو اٹھارہ واں پھاندتے ہی، باپ تیرے چوتڑ پر لات مارتا اور باہر نکال دیتا۔ یہ اپنا ہی ملک ہے جس میں اس قسم کی چوتیا پنتھی چلتی ہے۔۔۔ جب تیری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے تو میں تیری ماں کی چوری سے دس بیس پچاس ڈال دیتا تھا اور آج یہ اسی کے کارن ہے کہ وہ مجھے آنکھیں دکھاتی ہے اور کہتی ہے میں نے اپنی اولاد کو تباہ و برباد کر دیا۔ تیری وجہ سے میں نے اپنی زندگی تباہ و برباد کر لی۔ یہ تیرا ہی فقرہ ہے نا کہ میری ماں جس قسم کی عورت ہے، اس سے اچھا تو میرا باپ کوئی داشتہ رکھ لے۔۔۔ بول، کہا نہیں تو نے؟ جو بیٹا ماں کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے، وہ باپ کی بابت کیا کہے گا؟ روز تو ماں کو گالی دیتا ہوا نکل جاتا ہے اور جانتا ہے وہ گالی کسے پڑتی ہے؟ وہ تجھے گالی دیتی ہے تو گالی کسے پڑتی ہے؟ کیا اس گھر میں کوئی مالک نہیں، کوئی باپ نہیں؟ کیا ہوا جو ایک بار، زندگی میں صرف ایک بار گھاٹا پڑ گیا۔ میں نے لاکھ روپیہ گنوایا ہے تو آج ہی لاکھ روپے کا کانٹریکٹ کیا ہے، جس میں سے کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار بچ جائیں گے۔ جب تو تیری ماں بھی خوش ہو گی اور یہ لاڈو بھی، جو اس دن باپ کی بجائے مجھے انکل کہہ گئی اور تو بھی خوش ہو گا اور فخر سے میرا نام لے گا۔ میرے پاس ہو

ہو کر بیٹھے گا اور باتیں کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن میں۔۔۔ میں تم سب کو سمجھ گیا ہوں۔ منہ تک نہ لگاؤں گا کسی کو۔۔۔"

پال کے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا بھی تو صرف اتنا۔ "پر پپّا، میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے؟" سنت رام اور بھی بلند آواز سے چیخا "تم نے مجھے گالی دی ہے، جو کسی نے نہیں دی۔ کسی کی ہمّت ہی نہیں پڑی۔ سب جانتے ہیں نا، میں خالی ہاتھوں سے ان کی بوٹیاں اُڑا دوں گا۔ تیری یہ ہمّت کہ ایک سگریٹ تیرا پی جانے سے تو پورا پیکٹ میرے منہ پر دے مارے؟"

"ایک سگریٹ؟" پال نے کہا۔

"ہاں" سنت رام نے کہا۔ "تجھے پتہ چل گیا نا، میں نے تیرا ایک اسٹیٹ ایکسپریس صبح پی لیا تھا۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔"

اس سے پہلے کہ سنت رام جو کانپ رہا تھا، نیچے گر جاتا، بیٹے نے بڑھ کر تھام لیا اور

اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا۔۔۔ ”معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، پپّا!“

اگلے روز سنت رام حسبِ معمول صبح کے چار بجے اُٹھ گیا تھا۔ اسے پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دھوبن کو ڈسٹرب کیے بغیر وہ ساتھ کے کمرے میں چلا آیا جہاں پال، لاڈو اور اس کا بچّہ بابی سوئے ہوئے تھے۔ سنت رام نے زیرو پاور کا بلب جلایا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہلکی سی مدھم روشنی میں وہ سب فرشتے معلوم ہو رہے تھے۔۔۔ ایک سے ایک حسین اور خوبصورت اور خوشبودار۔ آج بابی کی بانہہ ماں کے گلے میں نہ تھی۔ وہ آزاد اور بے فکر سو رہا تھا۔

سنت رام نے سوچا۔۔۔ کالج بھیجنے سے پہلے میں نے اس بچّی کو لیکچر دیا تھا۔ لیکن اگر یہ کوئی بے راہ روی کرتی تو کیا میں اسے سڑک پہ پھینک دیتا؟ پال کا تجربہ ناکام ہوتا تو میں اسے زندگی کا کھیل نہ سکھاتا؟ یہ اخلاق۔۔۔ یہ تہذیب، سب باتیں ہیں یہ اور یہاں سے باہر کے سب بچّے جو کھیلتے ہیں، گرتے ہیں، پھر اُٹھ کر کھیلنے لگتے ہیں۔۔۔ دھوبن؟۔۔۔ دھوبن بے وقوف ہے، وہ نہیں جانتی کچھ۔۔۔ سوائے کپڑے دھونے کے۔۔۔

سنت رام نے اسٹیٹ ایکسپریس کا کارٹن نکالا اور اسے اپنے بیٹے کے سرہانے رکھ دیا۔ رات اس جھگڑے کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو دے ہی نہ سکا تھا۔ چلو، یہ اور بھی اچھا ہوا۔ جاگے گا تو ایک دم پورا کارٹن پا کر کتنا خوش ہو گا۔۔۔ پھر سنت رام نے بیٹے کے دیے ہوئے رشین سوبرائن کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالا، اسے جلایا اور دھوئیں کے بڑے بڑے کش چھوڑے۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی پہلے ہی کچھ نہیں ہوتی، اس پہ دھوئیں نے اور بھی منظر کو دھندلا دیا تھا اور بچّے فرشتوں سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے تھے۔ سنت رام کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر پال کا چہرہ چوم لے، لیکن کہتے ہیں، سوتے میں بچّے کا چہرہ نہیں چومتے۔ جانے کیوں؟ اس وقت تو سنت رام نے یہی سوچا کہ اگر اس نے ایسی حرکت کی تو وہ جگ جائیں گے۔۔۔

سوبرائن کے چوتھے کش میں کوئی نشہ تھا یا شاید سنت رام کی آنکھیں بیٹے کی شراب سے چڑھ گئی تھیں۔ اس نے دھواں صاف کرتے ہوئے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور پھر پرارتھنا کے لیے پوجا کے کمرے کی طرف چل دیا۔

کلیانی

اب اسے ان کالی، بھوری راہوں پہ چلنے سے کوئی ڈر نہ آتا تھا، جہاں بے شمار گڑھے تھے، جن میں کالا پانی، بمبئی کے اس صنعتی شہر کی میل ہمیشہ جمع رہتی تھی اور کبھی تہہ پہ تہہ بیٹھتی۔ بے شکل سے پتھّر، اِدھر سے اُدھر جیسے شوقیہ پڑے تھے۔ بے کار، آخری روڑا ہونے کے لیے۔۔۔ اور وہ۔۔۔ شروع کے دن جب ٹانگیں کانپتی تھیں اور تنکے بھی روکنے میں کامیاب ہو جاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلی کے موڑ پہ دیسی صابن کے بڑے بڑے چاک بنانے والا اور اس کے

پڑوس میں کا حجّام دیکھ رہے ہیں، اور برابر ہنس رہے ہیں۔ کم سے کم رو بھی نہیں رہے ہیں۔ پھر 'باجو' کا کوئلے والا، جو آپ تو شاید اس چکلے میں کبھی نہ گیا تھا، اس پہ بھی اس کا منہ کالا تھا۔۔۔

بغل میں پہلے مالے پہ کلب تھی، جہاں چوری کی رَم چلتی تھی اور یاری کی رَمی۔ اس کی کھڑکیاں کسی یوگی آنکھوں کی طرح سے باہر کی بجائے اندر من کے چکلے میں کھلتی تھیں اور ان میں سگریٹوں کے دھوئیں کی صورت میں آہیں نکلتی تھیں۔ لوگ یوں تو جوئے میں سینکڑوں کے ہاتھ دیتے تھے، مگر سگریٹ ہمیشہ گھٹیا پیتے تھے۔۔۔ بلکہ بیڑی، صرف بیڑی، جس کا جوئے کے ساتھ وہی تعلّق ہوتا ہے جو پنسلین کا آتشک سے۔۔۔ یہ کھڑکیاں اندر کی طرف کیوں کھلتی تھیں؟ نہ معلوم کیوں؟ مگر کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا، کیونکہ اندر کے صحن میں آنے والے مرد کی صرف چھایا ہی نظر آتی، جس سے معاملہ پٹائی ہوئی لڑکی اسے اندر لے جاتی، بٹھاتی اور ایک بار ضرور باہر آتی۔ نل پر سے پانی کی بالٹی لینے، جو صحن کے عین بیچوں بیچ لگا ہوا تھا اور دونوں طرف کی کھولیوں کی طرح طرح کی ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ پانی کی بالٹی اُٹھانے سے پہلے لڑکی ہمیشہ ہمیشہ اپنی دھوتی یا ساری

کو کمر میں کستی اور گاہک لگ جانے کی اکڑ میں کوئی نہ کوئی بات اپنی ہم پیشہ بہن سے ضرور کہتی۔۔۔ اے گر جا! جرا چاول دیکھ لینا، میرے کو گاہک لگا ہے۔۔۔ پھر وہ اندر جا کر دروازہ بند کر لیتی۔ تبھی گر جا سندری سے کہتی۔۔۔ کلیانی میں کیا ہے ری، آج اسے دوسرا کسٹمر لگا ہے؟ لیکن سندری کے بجائے جاڑی یا کھُرسید، جواب دیتی۔۔۔ اپنی اپنی قسمت ہے نا۔۔۔ تبھی کلیانی والے کمرے سے زنجیر لگنے کی آواز آتی اور بس۔ سندری ایک نظر بند دروازے کی طرف دیکھتی اور اپنے سنے ہوئے بالوں کو چھانٹتی، تولیے سے پونچھتی ہوئی گنگنانے لگتی۔۔۔ 'رات جاگی رے بلم، رات جاگی۔۔۔' اور پھر ایکا ایکی گر جا سے مخاطب ہو اُٹھتی۔۔۔ اے گر جا! کلیانی کے چاول اُبل رہے ہیں۔ دیکھتی نہیں کیسی گڑ گڑ کی آواز آرہی ہے۔ اس کے برتن سے؟ اور پھر تینوں چاروں لڑکیاں مل کر ہنستیں اور ایک دوسری کے کولہے میں چپّے دینے لگتیں۔ تبھی گر جا بلبلا اُٹھتی اور کہتی۔۔۔ ائیا جور سے کیوں مارا، رنڈی! جانتی ہے، ابھی تک دُکھ رہا ہے میرا پھُول؟ کان کو ہاتھ لگایا، بابا! میں تو کیا میری آل اولاد بھی کبھی کسی پنجابی کے ساتھ نہ بیٹھے گی۔ پھر گر جا بغل کی کھولی میں کسی چھوکری کو آواز دیتی۔۔۔

گنگی تیرا پوپٹ کیا بولتا۔۔۔؟

گنگی کی شکل تو نہ دکھائی دیتی، صرف آواز آتی۔۔۔ میرا پوپٹ بولتا، بھج من رام، بھج من رام۔۔۔

۔۔۔ مطلب گنگی کو یا تو سر میل ہے اور یا پھر کوئی کسٹمر نہیں لگا۔

مہی پت لال اب کے مہینوں کے بعد اِدھر آیا ہے۔ بیچ میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ یہاں سے کچھ ہی فرلانگ دور ایک نیپالی لڑکی چونی لا کے پاس چلا گیا تھا اور اس کے بعد چھیانوے نمبر کی ایک کرسچین چھوکری میں پھنس گیا، جس کا اصلی نام تو کچھ اور تھا لیکن وہاں کی دوسری لڑکیاں اور دلاّل اسے اولگا کے نام سے پکارتے تھے۔ ادھر کلیانی کو کچھ پتہ بھی نہ تھا، کیوں کہ اس دھندے میں تو دو چار مکانوں کا فاصلہ بھی سیکڑوں میل کا ہوتا ہے۔ لڑکیاں زیادہ سے زیادہ پکچر دیکھنے کو نکلتی تھیں اور پھر واپس۔۔۔ جس منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے مہی پت دوسری لڑکیوں کے پاس چلا گیا تھا، اسی کے لیے اس اڈّے پر لوٹ آیا۔ لیکن یہ بات طے تھی کہ اتنے مہینوں کے بعد وہ کلیانی کو بھول چکا تھا۔ حالانکہ 'ملک' جانے کے لیے اس نے کلیانی کو دو سو روپے بھی دیے تھے، تب شاید نشے کا عالم

تھا، جیسا کہ اب تھا۔ بیئر کا پورا پیگ پی جانے کے کارن مہی پت لال کے دماغ میں کسی اور ہی عورت کی تصویر تھی، اور وہ بھی نامکمل۔ کیونکہ اسے مکمّل تو مہی پت ہی کو کرنا تھا۔۔۔ ایک مصوّر کی طرح سے، جو کہ مرد ہوتا ہے اور تصویر، جو کہ عورت ہوتی ہے۔۔۔

اندر آتے ہی مہی پت نے صحن کے پہلے پیراپٹ کو پھلانگا۔ تین چار سیڑھیاں نیچے اُترا۔۔۔ لوگ سمجھتے ہیں پاتال، نرک کہیں دور، دھرتی کے اندر ہیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ وہ صرف دو تین سیڑھیاں نیچے ہیں۔ وہاں کوئی آگ جل رہی ہے اور نہ اُبلتے، کھولتے ہوئے کنڈ ہیں۔ ہو سکتا ہے سیڑھیاں اُترنے کے بعد پھر اسے کسی اوپر کے تھڑے پہ جانا پڑے، جہاں سامنے دوزخ ہے، جس میں ایسی ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں کہ انسان اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

سیڑھیاں اُترنے کے بعد، صحن میں پاؤں رکھنے کے بجائے مہی پت لال کھولیوں کے سامنے والے تھڑے پہ چلا گیا، کیونکہ پکا ہونے کے باوجود صحن میں ایک گڑھا تھا، جس میں ہمیشہ ہمیشہ پانی جمع رہتا تھا۔ برس ڈیڑھ برس پہلے بھی یہ گڑھا ایسا تھا اور اب بھی ایسا ہی۔ لیکن گڑھے کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا

پتہ ہو۔ اوپر صحن کے کھلے ہونے کی وجہ سے دشمی کا چاند گڑھے کے پانی میں جھلملا رہا تھا، جیسے اُسے میل، سر میل کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نل سے پانی کا چھینٹا اس پر پڑتا تو چاند کی چھبی کانپنے لگتی، پوری کی پوری۔۔۔

کچھ گاہک لوگ گرجا، سندری اور جاڑی کو یوں ٹھونک بجا کے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کچّے پکّے گھڑے ہوں۔ ان میں سے کچھ اپنی جیبیں ٹٹول رہے تھے۔ مستری جاڑی کے ساتھ جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ گرجا، سندری، کھُرسید سے زیادہ بدصورت تھی، مگر تھی آٹھ اینٹ کی دیوار۔ حیرانی تو یہ تھی کہ لڑکیوں میں سے کسی کو حیرانی نہ ہو رہی تھی۔ وہ مرد اور اس کے پاگل پن کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ مہی پت نے سندری کو دیکھا جو ویسے تو کالی تھی، مگر عام کونکنی عورتوں کی طرح تیکھے نقش نینوں والی۔ پھر کمر سے نیچے اس کا جسم، 'باپ رے' ہو جاتا تھا، تبھی مہی پت کے کُرتے کو کھینچ پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے کلیانی کھڑی تھی اور ہنستے ہوئے اپنے دانتوں کے موتی رول رہی تھی۔ مگر وہ دُبلی ہو گئی تھی۔ کیوں؟ نہ معلوم کیوں؟ چہرہ یوں لگ رہا تھا، جیسے دو آنکھوں کے لیے جگہ چھوڑ کر کسی نے ڈھولک پہ چمڑا مڑھ دیا۔ چونکہ عورت اور تقدیر ایک ہی بات ہے، اس

لیے مہی پت کلیانی کے ساتھ تیسری کھولی میں چلا گیا۔

کلب گھر کی کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا اور اوجھ کر بساط اُلٹ دی۔ کلیانی نے باہر آ کر نل پہ بالٹی بھری، دھوتی کو کمر میں کسا اور آواز دی۔۔۔ او گرجا، تھوڑا ہمارا گھڑی سنبھالنا اور پھر وہ پانی لے کر کھولی میں چلی گئی۔۔۔

پاس کی کھولی سے میڈم کی آواز آئی۔۔۔ ایک ٹیم کا، دو ٹیم کا؟

اندر کلیانی نے مہی پت کو آنکھ ماری اور میڈم والی کھولی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ایک ٹیم، اور پھر اس نے پیسوں کے لیے مہی پت کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا، جسے پکڑ کر مہی پت اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ پھر اُٹھ کر اُس نے پان سے پٹی، لال لال مہر سی کلیانی کے ہونٹوں پہ لگا دی جسے دھوتی کے پلّو سے پونچھتی ہوئی وہ ہنسی۔۔۔ "اتنے بے صبر؟"

اور پھر ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی۔ "تم ہم کو تیس روپے دے گا، پر ہم میڈم کو ایک ٹیم کا بولے گا۔ تم بھی اس کو نہیں بولنے کا۔۔۔ آں؟"

مہی پت نے ایسے ہی سر ہلا دیا۔ "آں"

بدستور ہاتھ پھیلائے ہوئے کلیانی بولی۔ ”جلّی نکال۔“

”پیسے؟“ مہی پت بولا۔

کلیانی نے اب کے رسم نہیں ادا کی، وہ سچ مچ ہنس دی۔ نہیں، وہ شرما گئی۔ ہاں، وہ دھندا کرتی تھی۔ اور شرماتی بھی تھی۔ کون کہتا ہے، وہاں عورت عورت نہیں رہتی؟ وہاں بھی حیا اس کا زیور ہوتا ہے اور حربہ۔۔۔ جس سے وہ مرتی ہے اور مارتی بھی۔ مہی پت نے تیس روپے نکال کر کلیانی کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ کلیانی نے ٹھیک سے گِنا بھی نہیں۔ اس نے تو بس پیسوں کو چوما، سر اور آنکھوں سے لگایا، بھگوان کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور میڈم کو ایک ٹائم کے پیسے دینے اور اپنے حصّے کے پانچ لے کر رکھنے، اندر کے دروازے کی طرف سے اور بھی اندر چلی گئی۔ مہی پت کو جلدی تھی۔ وہ بے صبری سے دُرگا میّا کی تصویر کو دیکھ رہا تھا، جو شیر پہ بیٹھی تھی اور جس کے پاؤں میں راکھشس مرا پڑا تھا۔ دُرگا کی درجنوں بھجائیں تھیں، جن میں سے کسی میں تلوار تھی اور کسی میں برچھی اور کسی میں ڈھال۔ ایک ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا، بالوں سے تھاما ہوا۔ اور مہی پت کو معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ اس کا اپنا سر ہے۔ لیکن دُرگا کی چھاتیاں اس کے کولہے

اور رانیں بنانے میں مصوّر نے بڑے جبر سے کام لیا تھا۔ دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ وہ کوئی بات نہ تھی لیکن ان پہ لپکتی ہوئی سیل اور اس میں گڈ مڈ کائی نے عجیب بھیانک سی شکلیں بنا دی تھی، جن سے طبیعت بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیواریں نہیں، تبتّی اسکول ہیں، جن پر نرک اور سورگ کے نقشے بنے ہیں۔ گنہگاروں کو اژدھے ڈس رہے ہیں اور شعلوں کی لپلپاتی ہوئی زبانیں انہیں چاٹ رہی ہیں۔ پورا سنسار کال کے بڑے بڑے دانتوں اور اس کے کھوہ ایسے منہ میں پڑا ہے۔

۔۔۔ وہ ضرور نرک میں جائے گا۔۔۔ مہی پت۔۔۔ جانے دو!

کلیانی لوٹی اور لوٹتے ہی اس نے اپنے کپڑے اُتارنے شروع کر دیے۔

یہ کھیل مرد اور عورت کا۔۔۔ جس میں عورت کو اذیّت نہ بھی ہو، تو بھی اس کا ثبوت دینا پڑتا ہے اور اگر ہو تو مرد اُسے نہیں مانتا۔

مہی پت پہلے تو ایسے ہی کلیانی کو نوچتا کاٹتا رہا۔ پھر وہ کُود کر پلنگ سے نیچے اُتر گیا۔ وہ کلیانی کو نہیں، کائنات کی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا، کیونکہ کلیانیاں تو آتی ہیں اور

چلی جاتی ہیں۔ مہی پت بھی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، لیکن عورت وہیں رہتی ہے اور مرد بھی۔ کیوں؟ یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حالانکہ اس میں سمجھ کی کوئی بات ہی نہیں۔

ایک بات ہے ست جگ، ددا پر اور تر تیا جگوں میں تو پورا نیائے تھا، پھر بھی عورتیں محبت میں کیوں چوری کر جاتی تھیں؟ جب گنکا ویشیا کیوں تھیں؟ آج تو انیائے ہے۔۔۔ پگ پگ پہ انیائے۔ پھر انہیں کیوں روکا جاتا ہے؟ کیوں ان پر قانون لگائے جاتے ہیں؟ جو روپیہ ٹکسال سے آتا ہے، اُس کی قیمت آٹھ آنے رہ جاتی ہے۔ افلاس اور وافر پیسے کے میل جول کی جتنی ضرورت آج ہے، تاریخ میں کبھی ہوئی ہے؟ دبالیں اسے تاکہ گھر کی لکشمی باہر نہ جائے مگر دولت، پیسہ تو Goddess Bitch ہے، وہ کُتّیا بو پہ آئے گی تو جائے گی ہی۔۔۔

مہی پت کو الجھاوے کی ضرورت تھی، اسی لیے اُسے کائنات کی عورت کے پیچ و خم کھا گئے۔ اس نے ایک بیئر کے لیے کہا، لیکن اس سے پہلے کہ کلیانی کا کالا وجود اُٹھ کر لڑکے کو آواز دے، وہ خود ہی بول اُٹھا۔۔۔ رہنے دو، اور اس نظّارے کو دیکھنے لگا جو نشے سے بھی زیادہ تھا۔ پھر جانے کیا ہوا، مہی پت نے جھپٹ کر اتنے

زور سے کلیانی کی ٹانگیں الگ کیں کہ وہ بلبلا اُٹھی۔ اپنی بربریّت سے گھبرا کر مہی پت نے خود ہی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اب کلیانی پلنگ پر پڑی تھی اور مہی پت گھٹنوں کے بل نیچے فرش پہ بیٹھا ہوا تھا اور اپنے منہ میں زبان کی نوک بنا رہا تھا۔۔۔ کلیانی لیٹی ہوئی اور چھت کو دیکھ رہی تھی، جہاں پنکھا جالے میں لپٹا ہوا، ایک آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی کلیانی کو کچھ ہونے لگا۔ اس کے پورے بدن میں مہی پت اور اس کی زبان کے کارن ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اور وہ اس چیونٹے کی طرح سے تلملانے لگی، جس کے سامنے بے رحم بچّے جلتی ہوئی ماچس رکھ دیتے ہیں۔۔۔

جبھی اپنے آپ سے گھبرا کر مہی پت اوپر چلا آیا۔ اس کے بدن میں بے حد تناؤ تھا، اور بجلیاں تھیں، جنہیں وہ کیسے بھی جھٹک دینا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی پکڑ اس قدر مضبوط تھی کہ جابر سے جابر آدمی اس سے نہ نکل سکتا تھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی کلیانی کی طرف دیکھا۔ اُسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ایک پیشہ ور عورت کی چھاتیوں کا وزن بھی ایکا ایکی بڑھ سکتا ہے اور ان کے حلقے اور دانے پھیل کر اپنے مرکز، ابھرے ہوئے مرکز کو بھی معدوم کر سکتے ہیں۔ ان کے اردگرد اور

کولھوں اور رانوں پر سیتلا کے داغ اُبھر سکتے ہیں۔ اپنی وحشت میں وہ اس وقت کائنات کی عورت کو بھی بھول گیا اور مرد کو بھی۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ رہا کہ وہ خود کہاں ہے اور کلیانی کہاں؟ وہ کہاں ختم ہوتا ہے اور کلیانی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ وہ اس قاتل کی طرح سے تھا جو چھت پر سے کسی کو دھکیل دیتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے نا کہ اتنی بلندی سے گر کر وہ بیان دینے کے لیے بھی زندہ نہ رہے گا اور وہ اس پہ خودکُشی کا الزام لگا کر خود بچ نکلے گا۔ ایک جست کے ساتھ اس نے اپنا، پورے بدن کو کلیانی پہ پھینکنا شروع کر دیا۔

ایک دلدوز سی چیخ نکلی اور بلبلاہٹ سنائی دی۔ سیل اور کائی سے پٹی دیواروں پہ پنکھوں کے پر اپنی بڑی بڑی پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ جانے کس نے پنکھے کو تیز کر دیا تھا؟ مہی پت پسینے سے شرابور تھا اور شرمندہ بھی، کیونکہ کلیانی رو رہی تھی، کراہ رہی تھی۔ یا وہ ایک عام کسبی کی طرح سے گاہک کو لات مارنا نہ جانتی تھی اور یا پھر وہ اتنے اچھے گاہک کو کھو دینے کے لیے تیّار نہ تھی۔

سرہانے میں منھ چھپائے، کلیانی اُلٹی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے شانے پھڑکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی یہی مہی پت ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔

پھر آگے بڑھ کر اس نے کلیانی کے چہرے کو ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی، مگر کلیانی نے اسے جھٹک دیا۔ وہ سچ مچ رو رہی تھی۔ اس کے چہرے کو تھامنے میں مہی پت کے اپنے ہاتھ بھی گیلے ہو گئے تھے۔ آنسو تو اپنے آپ نہیں نکل آتے۔ جب جبر اور بے بسی خون کی ہولی کھیلتے ہیں، تبھی آنکھیں چھان پھٹک کر اس لہو کو صاف کرتی ہوئی چہرے پہ لے آتی ہیں۔ اگر اسے اپنے ہی رنگ میں لے آئیں تو دنیا میں مرد دکھائی دے نہ عورت۔

کلیانی نے پھر اپنا چہرہ چھڑا لیا۔

مہی پت پہلے صرف شرمندہ، پھر سچ مچ شرمندہ تھا۔ اس نے کلیانی سے معافی مانگی اور مانگتا ہی چلا گیا۔ کلیانی نے پلنگ کی چادر سے آنکھیں پونچھیں اور بے بسی سے مہی پت کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اُٹھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر اپنے گھنگھریالے بالوں والا کونکنی سر رکھ دیا۔ پھر اس کی گھِگھی بندھ گئی، جس سے نکالنے میں مہی پت کو اور بھی تلذّذ کا احساس ہوا۔۔۔ اور کلیانی کو بھی۔ اس نے اپنے گھاتک ہی کی پناہ ڈھونڈ لی۔ مرد تو مرد ہو گا ہی، باپ بھی تو ہے، بھائی بھی تو ہے۔۔۔ عورت عورت ہی سہی، مگر وہ بیٹی بھی

توہے، بہن بھی توہے۔۔۔

۔۔۔اور ماں۔۔۔

مہی پت کی آنکھوں میں سچ مچ کے پچھتاوے کو دیکھتے ہی تصویر اُلٹ گئی۔ اب اس کا سر کلیانی کی چھاتی پر تھا اور وہ اسے پیار کر رہی تھی۔ مہی پت چاہتا تھا کہ وہ اس عمل کو انجام پہ پہنچائے بغیر ہی وہاں سے چلا جائے، لیکن کلیانی اس توہین کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

کلیانی نے پھر اپنے آپ کو اذیّت ہونے دی۔ بیچ میں ایک دوبار وہ درد سے کراہی بھی اور پھر بولی۔۔۔ ہائے میرا پھول۔۔۔ بھگوان کے لیے۔۔۔ میرے کو سوئی لگوانا پڑتا۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ اُس نے دکھ اور سکھ سہتے ہوئے کائنات کے مرد کو ختم کر دیا اور اُسے بچّہ بنا کر گود میں لے لیا۔ مہی پت کے ہر اُلٹے سانس کے ساتھ کلیانی بڑی نرمی، بڑی ملائمت اور بڑی ہی ممتا کے ساتھ اُس کا منہ چوم لیتی تھی، جس سے سگریٹ اور شراب کا تعفّن لپک رہا تھا۔

دھونے دھلانے کے بعد مہی پت نے اپنا ہاتھ کپڑوں کی طرف بڑھا دیا، مگر کلیانی

نے تھام لیا اور بولی۔ ”میرے کو بیس روپیہ جیا ستی دو۔“

”بیس روپیہ؟“

”ہاں۔“ کلیانی نے کہا۔ ”ہم تمھارا گن گائے گا۔ ہم بھولا نہیں، او دن جب ہم ’ملک‘ گیا تھا، تو تم ہم کو دو سو روپیہ رو کڑا دیا۔۔۔ ہم کاردار کا بڑا مندر میں ایک ٹانگ سے کھڑا ہو کے تمہارے واسطے پرارتھنا کیا اور بولا۔۔۔ میرا مہی کار کھشا کرنا بھگوان۔۔۔ اس کو لمبا جندگی دینا، پیسہ دینا۔۔۔“

اور کلیانی امید بھری نظروں سے پہلی اور اب کی پرارتھنا کا اثر دیکھنے لگی۔

مہی پت کے نتھنے نفرت سے پھولنے لگے۔ پیشہ ور عورت! پچھلی بار دو سو روپے لینے سے پہلے بھی ایسے ہی ٹسوے بہائے تھے اس نے۔۔۔ یوں روئی چِلاّئی تبھی، جیسے میں کوئی انسان نہیں جانور ہوں، وحشی ہوں۔۔۔ مگر، اور بیس روپے؟ پھر رونے کی کیا ضرورت تھی، آنسو بہانے کی؟ ویسے ہی مانگ لیتی تو کیا میں انکار کر دیتا؟ جانتی بھی ہے، میں پیسے سے انکار نہیں کرتا۔ دراصل انکار مجھے آتا ہی نہیں۔ اسی لیے تو بھگوان کا سو شکر کرتا ہوں کہ میں عورت پیدا نہیں ہوا،

ورنہ۔۔۔ میں تو یہاں منہ مانگے دینے کا قائل ہوں، جس سے پھر گناہ کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آدمی کا تو انتظار کیا کرتی ہیں یہ۔۔۔ اور جب وہ آتا ہے تو اس سے جھوٹ بولنے، اس کے کپڑے اُتارنے سے بھی نہیں چوکتیں۔۔۔ کہتی ہیں، میں نے سوچا تھا تم منگل کو جرور آؤ گے۔۔۔ منگل کو کیا ہے بھائی؟ منگل کو میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی!۔۔۔ یہ رونا۔۔۔ شاید سچی روئی ہو۔۔۔ میں نے بھی تو ایک اندھے کی طرح سے کہیں بھی چلنے دیا اپنے آپ کو۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ تاؤ کتنا اچھا تھا!۔۔۔ مگر میں نے جو اذیّت دی ہے اُسے، اس سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔۔۔ دے دو روپے۔۔۔ مگر کیوں؟ پہلے ہی میں نے اُسے دو ٹائم کے پیسے دیے اور ایک ہی ٹائم بیٹھا۔

مہی پت کے حیص بیص کو دیکھ کر کلیانی نے کہا۔ ”کیا سوچنے کو لگ گیا؟ دے دو نا۔۔۔ میرا بچّہ تم کو دُعا دے گا۔“

”تیرا بچّہ؟“

”ہاں۔۔۔ تم نے نہیں دیکھا؟“

”نہیں۔۔۔ کہاں، کس سے لیا؟“

کلیانی ہنس دی۔ پھر وہ لجا گئی۔ اس پہ بھی بولی۔ ”کیا مالم کس کا؟ میرے کو سکل تھوڑا دھیان میں رہتا؟ کیا کھبر تمہارا ہو۔“

مہی پت نے گھبرا کر کُرتے کی جیب میں سے بیس روپے نکال کر کلیانی کے ہاتھ پر رکھ دیے، جو ابھی تک برہنہ کھڑی تھی اور جس کی کمر اور کولھوں پر پڑا ہوا چاندی کا پٹکا چمک رہا تھا۔ ایک ہلکا سا ہاتھ کلیانی کے پیچھے تھپتھپاتے ہوئے مہی پت نے کچھ اور سوچ لیا۔ کلیانی نے ساری پکڑ کر لپیٹی ہی تھی کہ وہ بولا۔ ”اگر ایک ٹائم اور بیٹھ جاؤں تو؟“ (پیسے دے دیے ہیں)

”بیٹھو۔“ کلیانی نے بنا کسی جھجک کے کہا اور اپنی ساری اُتار کر پلنگ پر پھینک دی۔ چُلوں چُلوں کرتا ہوا اس کا گوشت سب مار بھول چکا تھا۔ عقل حیوانی سے بھی تجاوز کر چکا تھا۔۔۔ لیکن مہی پت نے سر ہلا دیا۔۔۔ ”اب دم نہیں رہا!“

”ہوں۔“ کلیانی نے کہا۔ ”بہت جن آتا میرے ادھر، پر تم سا کڑک ہم نہیں دیکھا، سچی۔۔۔ تم جاتا تو بہت دن یہ (ناف) ٹھکانے پہ نہیں آتا۔“

چاند گڑھے پر سے سرک گیا تھا۔ کوئی بالکل ہی لیٹ جائے، تو اسے دیکھ پائے۔ تبھی کلیانی مہی پت کا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے میں لے آئی، جہاں گر جا، سندری، جاڑی وغیرہ تھیں۔ جاڑی، مستری اور اس کے بعد ایک بوہرے کو بھی بھگتا چکی تھی۔ ایک سردار سے جھگڑا کر چکی تھی۔ جب مہی پت آیا تو اُس نے کھُرسید کے کہنی ماری اور بولی۔۔۔ ''آیا، کلیانی کا مرد۔۔۔'' اس لیے کہ پہلے جب مہی پت ادھر آیا تھا، تو ہمیشہ کلیانی ہی کے پاس۔۔۔

کلیانی کے ساتھ کھولی میں آتے ہوئے، مہی پت نے باتھ روم کے پاس پڑی ہوئی گٹھری کو دیکھا، جس کے پاس بیٹھی ہوئی گرجا اپنے پلّو سے اُسے ہوا کر رہی تھی۔ کلیانی نے گٹھری کو اُٹھا لیا اور مہی پت کے پاس لاتے ہوئے بولی۔۔۔

''دیکھو، دیکھو میرا بچّہ۔۔۔''

مہی پت نے اس لجلجے چار پانچ مہینے کے بچّے کی طرف دیکھا، جسے گود میں اُٹھائے ہوئے کلیانی کہہ رہی تھی۔۔۔ ''اسی ہلکٹ کو پیدا کرنے، دودھ پلانے سے ہم یہ ہو گیا۔ کھانے کو کچھ ملتا نہیں نا۔۔۔ اس پہ تم آتا تو۔۔۔''

پھر ایکا ایکی مہی پت کے کان کے پاس منہ لاتے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔ ”سندری کو دیکھتا؟ تم بولے گا تو ہم اگلے ٹائم سندری کو لا دے گا۔۔۔ نہیں، نہیں، پرسوں ہم آپی اچھا ہو جائے گا۔ یہ سب جگہ بھر جائے گا نا۔۔۔“ اور کلیانی نے اپنی چھاتی اور اپنے کولھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔۔۔ ”یہ سب، جن سے تم اپنا ہاتھ بھرتا، اپنا باجو بھرتا۔۔۔ ٹھیک ہے۔ کچھ ہاتھ میں بھی تو آنا مانگتا۔۔۔ سندری کو لینا ہوئیں گا، تو میرے کو بولنا۔ ہم سب ٹھیک کر دے گا۔ پر تم کو آنے کا میرے پاس۔ گرجا کے پاس نہیں آنے کا۔ او جھنا اوں آں بوت کرتا، بوت نکھرا اس کا۔۔۔“ اور پھر بچّے کو اپنے بازوؤں میں جھلاتے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔ ”ہم اس کا نام اچمی رکھا۔“

”اچمی۔ اچمی کیا؟“

”یہ تو ہم کو نہیں مالم۔“ کلیانی نے جواب دیا۔ اور پھر تھوڑا ہنسی۔ ”کوئی آیا تھا کسٹمر، بولا۔۔۔ میرا تیرے کو ٹھہر گیا تو اس کا نام اچمی رکھنے کا۔ یہ تو ہم نہیں بولنے سکتا، اسی کا ٹھہرا کہ کس کا، پر نام یاد رہ گیا میرے کو۔ او تو پھر اَیاچ نہیں اور تم بھی کوچھ نہیں بولا۔“ اور پھر اور ہنستے ہوئے بولی۔۔۔ ”اچھا، اگلے ٹیم دیکھیں

گا۔"

مہی پت نے ایک نظر اچمی کی طرف دیکھا اور پھر ارد گرد کے ماحول کی طرف۔ یہاں پلے گا یہ بچّہ! بچّہ۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا، ان لڑکیوں کے پاس آتا ہوں تو میں کوئی پاپ نہیں کرتا۔ یہ دس کی آشا رکھتی ہیں، تو میں بیس دیتا ہوں۔۔۔ یہ بچّہ؟

۔۔۔ یہاں تو دم گھٹتا ہے۔۔۔ جاتے سمے تو گھٹتا ہی ہے۔۔۔

مہی پت نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکالا اور اسے بچّے پہ رکھ دیا۔۔ یہ اس دنیا میں آیا ہے، اس لیے یہ اس کی دکشنا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ یہ ہم نہیں لیں گا۔"

"لینا پڑے گی، تم انکار نہیں کر سکتیں۔"

پھر واقعی کلیانی انکار نہ کر سکی۔ بچّے کی خاطر؟ مہی پت نے کلیانی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "مجھے معاف کر دو کلیانی۔ میں نے سچ مچ آج تم سے جانوروں کا سلوک کیا ہے۔" لیکن مہی پت کی بات سے یہ بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ اب وہ ایسا نہ کرے گا۔ ضرور کرے گا وہ۔ اسی بات کا تو نشہ تھا اُسے، بیئر تو فالتو

سی بات تھی۔

کلیانی نے جواب دیا۔ ”کوئی بات نہیں۔ پر تم آج کھلاس کر دیا، مار دیا میرے کو۔“ اور وہ یہ شکایت کچھ اس ڈھب سے کر رہی تھی، جیسے مرنا ہی تو چاہتی تھی وہ۔ کیا اس لیے کہ پیسے ملتے ہیں، پیٹ پلتا ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہاں، جب بھوک سے پیٹ دُکھتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے، دنیا میں سارے مرد ختم ہو گئے۔ عورتیں مر گئیں۔۔۔ مہی پت نے پوچھا۔ ”یہ اچمی لڑکا ہے یا لڑکی؟“

ایک عجیب سی کرن نے کلیانی کے پٹے، مار کھائے ہوئے چہرے کو منوّر کر دیا اور وہ چہرے کی پنکھڑیاں کھولتے ہوئے بولی۔۔۔ ”چھوکرا!“

پھر کلیانی نے جلدی اچمی کا لنگوٹ کھولا اور دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر اچمی کے لڑکے پن کو مہی پت کے سامنے کرتی، اتراتی ہوئی بولی۔۔۔ ”دیکھو، دیکھو۔۔۔“

مہی پت کے منہ موڑتے ہی کلیانی نے پوچھا۔۔۔ ”اب کبھی آئیں گا؟“

”جلدی۔“ مہی پت نے گھبرا کر جواب دیا اور پھر وہ باہر کہیں روشنیوں میں منہ چھپانے کے لیے نکل گیا۔

مِتھُن

بازار ہی لمبا ہو گیا تھا اور یا پھر کاروبار چھوٹا معلوم ہو تا تھا۔ پچھم کی طرف، جہاں سڑک تھوڑا اُٹھتی، آسمان سے لپٹتی اور آخر ایک دم نیچے گر جاتی ہے، وہیں دنیا کا کنارہ ہے، جہاں سے ایک جست کر لیں گے، اس جینے کے ہاتھوں مر لیں گے۔

دن بھر سر دُھننے کے بعد مگن ٹکلے۔۔۔ کباڑیے کو دو ہی چیزیں ہاتھ لگی تھیں۔ ایک فلورنٹین اور دوسری جیمنی رائے۔ فلورنٹین کو تو شاید کوئی سَر پھرا فلم پروڈیوسر کرایے پر لے بھی جاتا، مگر جیمنی رائے؟ کوئی بات نہیں۔ آج وہ اسے

چھپا کر رکھے گا تو کل اس کے پوتے پڑپوتے اس سے کروڑوں کمائیں گے، جیسے آج بھی پچھم میں کسی کے ہاں سے لیونارڈو کے اسکیچ نکل آئیں تو آرٹ کے بازاروں میں ان کی بولی لاکھوں تک جاتی ہے۔ ان لاکھوں کروڑوں کے خیال ہی سے مگن لال کی آنکھوں میں بجلیاں کوندنے لگیں اور وہ یہ بھول ہی گیا کہ وہ چالیس بیالیس سال کا اور ٹکلا۔۔۔ گنجا ہونے کے باوجود کنوارہ ہے، اس لیے پوتوں اور پڑپوتوں کی بات ہی نہیں۔ مگن کرتا بھی کیا؟ وہ ایک عام ہندو تھا، اتنے بڑے فلسفے کا مالک ہونے کے باوجود جس کے اندر کا بنیا پن نہیں جاتا۔ وہ باتوں میں مایا اِت آدِ کہہ کر اُسے پرے دھکیل دیتا ہے، لیکن بھیتر سے اسے جی جان سے لگاتا ہے۔ دنیا بھر میں پیسے کی اگر کوئی پوجا کرتا ہے تو ہندو۔ آج بھی اس کے ہاں دیوالی کے روز پرات کے نیچے، جیوتی کے ساتھ، دودھ پانی میں نہایا، سیندور میں لگایا ہوا روپیہ ملے گا۔ دسہرے کے دن اس کی گاڑی پہ صد برگ کے ہار ہوں گے اور سب نرناری مل کر لکشمی کے مندر کو جائیں گے۔۔۔ پوجا کے لیے، پیسے کے لیے تو وہ یوسف سابرَ اور پدمنی ایسی پتنی کو بھی بیچنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اور سامنے تھا سراجا۔۔۔ اِیوز بیٹری کا ایجنٹ۔ اس کی دکان تھوڑا پیپل کے گھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی، لجلجے ہندو جس پہ صبح کے وقت آکر پانی میں ملے دودھ کے لوٹے ڈال جاتے تھے اور دکان اور سڑک کے بیچ کی جگہ کیچ سے اَٹ جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندستان میں رہ جانے والے سراجو کو لجلجے ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا۔ البتہ نہیں کرتے تھے تو دوغلے کتّے، جو دن بھر ٹانگ اُٹھا اُٹھا کر اس پیڑ پہ پیشاب کرتے رہتے تھے، جس کے بارے میں بھگوان نے کہا تھا۔۔۔ اوروکشوں میں میں پیپل ہوں۔ ضرور وہ پچھلے جنم میں مسلمان ہوں گے جو سینتالیس کے فسادوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔

سراجا ہمیشہ پیپل کی گولریں کھاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجہ بازار کا مندا ہونا یا بھوک نہ تھی۔ سراجا ہر اس چیز کو کھاتا تھا جو اس کی منی کو مغلّظ کر دے۔ ہاں، مسلمان لِنگ کٹوں کا یہی ہے نا۔ کھانا، پینا اور سنبھوگ کرنا۔ وہ دماغی طور پر کوئی ہو بو، کوئی خانہ بدوش ہیں، جو ہندستان میں رہیں تو پاکستان کی باتیں کریں گے۔ پاکستان میں ہوں گے تو۔۔۔ میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے۔ انہیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں۔ مگن ٹکلے نے کئی بار اس بارے میں سوچا بھی۔۔۔ ان کا اللہ خوب عیش

کرتا ہے۔ ایک اپنا بھگوان ہے، جو نیچے کے بجائے اوپر ترِکُٹی کے آس پاس ہی منزل ہوتا رہتا ہے۔ شاید سرا جانے بوجھے بنا ایک تانترک تھا، جو بند دُر کھشا کے لیے کنڈ نسی کو جگاتے اور اوپر کا راستہ بناتے تھے۔ وہ عورت کے اندر اکڑے پڑے رہتے، لیکن کسی طرح اپنے جوہرِ حیات کو نہ جانے دیتے۔ نجات کو اس خود غرضانہ طریقے سے پانے والوں، عورت کو صرف ایک ذریعہ بنانے والوں نے کبھی یہ سوچا کہ اس بیچاری کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ اسے بھوکا، پیاسا، روتا، تڑپتا رکھ کر کیسے موکش کو پہنچ سکتا ہے کوئی؟ کس پرماتما کو پا سکتا ہے؟ پھر جو نجات بند سے چھٹکارا پالینے میں ہے۔۔۔ پُرش کے لیے، استری کے لیے؟ سواتی بوند تو موتی نہیں، نہ سیپی موتی ہے، موتی تو بوند کے گرنے اور سیپی کے اسے اپنے اندر لے کر منہ بند کر لینے میں ہے۔

رات لپک آئی تھی۔ باہر وہ دنیا کا کنارا اندھیرے کے ساتھ کچھ اور بھی پاس رینگ آیا تھا۔ ریشم والے ولایتی رام، کشمیری بڈشاہ، حتیٰ کہ اڈپی کے چکرپانی کی دکان بھی بند ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے مہینے کا دوسرا سنیچر ہونے کی وجہ سے اس کے سب اِدلی دوسے، سانبر ردا کسیری بک گئے ہوں۔ صرف سراج کی دکان کھلی

تھی۔ نہ جانے وہ کس مار پہ تھا؟ شاید اس لیے کہ بیڑی کی ضرورت رات ہی کو پڑتی ہے، مگر وہ صبح، صبح کاذب ہی کو دکان کھول لیتا تھا، جو رات ہی کا حصّہ ہوتی ہے، اس کا آخری حصّہ۔ ورنہ صبح کہاں کسی کی رہی، وہ کمیونسٹوں کی ہولی۔ شاید سراج، ٹورسٹ ایجنٹ مائیکل کی انتظار میں تھا تا کہ وہ دونوں مل کر اگلے روز کہیں آگرے، کھجوراہو کا پروگرام بنالیں، تھوڑے پیسے کمالیں۔ نہیں، سراج پیسے کے پیچھے تھوڑا جاتا تھا؟ وہ تو جاتا تھا ان پچھمی عورتوں کے پیچھے جو کثیر الازدواجی کی وجہ سے بھوکی پیاسی آتی تھیں اور یہاں آکر ممتاز کی محبت کو اِدھر کے کسی بھی شاہجہاں طبیعت والے مرد پہ آزماتیں اور کھجوراہو کے مِتھُن کو زندہ کرتی تھیں۔

جبھی سراج کی آواز نے مگن لال کو چونکا دیا۔

"ہیلو، سویٹ پائی۔۔۔"

سراج تقریباً اَن پڑھ تھا، مگر ٹورسٹوں کے ساتھ رہنے سے اتنی انگریزی سیکھ گیا تھا۔ اس کی آواز سے مگن سمجھ گیا۔ کیرتی آئی ہے۔

وہ سچ مچ کیرتی ہی تھی، جو چھوٹے قد، گٹھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی ایک اداس لڑکی تھی۔ اس کا رنگ پکا تھا۔ پھر اوپر سے جامنی رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ جب وہ آئی تو یوں لگا جیسے اندھیرے کا کوئی ٹکڑا متشکل ہو کر سامنے آ گیا۔ وہ ہمیشہ رات ہی کو آتی تھی، جیسے اُسے اپنا آپ چھپانا ہے اور شاید اسی لیے سراجو کی دکان کھلی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح سے اس کی طرف دیکھے، اس سے بات کیے بغیر نکل آئی تھی۔ اس کے باوجود سراج سیٹیاں بجا رہا تھا۔

مگر کیرتی بات ہی کہاں کرتی تھی۔ اِس سے، اُس سے، کسی سے بھی نہیں۔ اس سے بات کرنے کے لیے سوال کچھ یوں وضع کرنے پڑتے تھے کہ ان کا جواب ہاں ہو یا نہ۔ صرف اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں سر ہلانے سے بات بن سکے۔ سراج کا اسے چھیڑنا مگن کو بہت ناپسند تھا۔ اس نے کئی بار مگن سے کہا بھی تھا ۔۔۔تو کہیں عشق کے چکّر میں تو نہیں پڑ گیا؟ جوان لڑکی ہے۔ کھینچ ڈال۔ بہت اِدھر اُدھر رہا، لکے کبوتر کی طرح سے تو وہ اُڑ جائے گی۔ لیکن مگن نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

درحقیقت مگن ٹکلے کا دھندہ سدِّباب ہوتا تھا۔ کیرتی کوئی لکڑی کا کام یا شلپ بنا کر

بیچنے کی غرض سے اس کے پاس لاتی، تو وہ اس میں بہت کیڑے نکالتا۔ کبھی کہتا ایسی چیزوں کی آج مانگ ہی نہیں اور کبھی یہ کہ وہ فن کے معیار و محک پہ پوری نہیں اُترتیں۔ کیرتی اور بھی منھ لٹکا لیتی، حالانکہ ان سب باتوں سے مگن لال کا ایک ہی مقصد ہوتا کہ وہ سو کی چیز پانچ دس میں دے جائے اور پھر یہ اُسے سیزن کر کے سیکڑوں میں بیچے۔

کیرتی نے یہ کام کسی آرٹ اسکول میں نہ سیکھا تھا۔ اس کا باپ نارائن ایک شلپی تھا، جو بھاؤ داجی اور جیمز برگس وغیرہ کے ساتھ نیپال اور جانے کہاں کہاں ہندستان کی وراثت کو ڈھونڈتا پھرا تھا، جو کہ دراصل لندن کے میوزیم، نیویارک اور شکاگو کی اینٹیک کی دکانوں میں رُل رہی تھی۔ ہر سال ہمارے مندروں اور صنم خانوں سے سیکڑوں مورتیاں غائب ہوتیں اور ہزاروں میل دور کیوریو وغیرہ کی دکانوں میں جگہ پاتیں۔ نارائن مسلسل سفر سے تنگ آکر لوٹ آیا تھا اور گھر ہی میں شلپ بنانے شروع کر دیے تھے، جنھیں کیرتی بڑے انہماک سے دیکھتی رہتی تھی اور بیچ میں اوزار پکڑانے اور رف ورک کرنے میں باپ کی مدد بھی کرتی تھی۔ یوں گھر بیٹھ جانے میں نارائن اس بات کو بھول ہی گیا کہ کھویا ہوا ورثہ پائے

ہوئے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس کے دُگنے چوگنے ہی نہیں، سو گنا دام ملتے ہیں۔ شاید وہ جانتا بھی تھا لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو پیسے کی ماہیت کو سمجھ جاتے ہیں اور زندگی کے پھیلاؤ میں نہیں دیکھتے۔ وہ شلپ بناتا اور مشکل سے روٹی کماتا تھا۔ آخر ایک دن دو روٹیوں کے درمیان اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ جگدمبا کا بُت بنا رہا تھا، جب کہ اس کا اپنا ہی چنرل اس کے ہاتھ میں لگ گیا جس سے اُسے ٹیٹنس ہو گیا اور وہ قریب کے چھاؤنی کے اسپتال میں مر گیا۔ کہتے ہیں وہ کتّے کی موت مرا۔ کیوں نہ ایسی موت مرتا؟ جب وہ دیوی کا بت بناتا تھا تو دنوں، مہینوں اس کی چھاتیوں، اس کے کولھوں اور رانوں پہ ٹھہرا رہتا۔ چھوٹے شلپوں میں تو چھاتیاں خلا میں گھومتے ہوئے لٹّو معلوم ہوتی تھیں، لیکن بڑوں میں ٹانگیں اور ٹارسو ایک طرح کی گھڑونچی تھے۔ اصل بات وہ دودھ کے بڑے بڑے مٹکے تھے، جو اس پہ رکھے ہوتے تھے اور کولھے ہتھنی کے ماتھے کی طرح سے، جس کے نیچے سے ایک کی بجائے دو سونڈیں نکلتی تھیں۔ اس نے دُرگا کا شلپ بھی بنایا تھا، جو بڑی جبر جنگ دیوی سی ہے۔ ایسی دیویوں کے بدن بناتے ہوئے نارائن کتّے کی نہیں تو کیا ہماری آپ کی موت مرتا؟

”کیالائی ہو؟“مگن ٹکلے نے کیرتی سے پوچھا۔

کیرتی نے اپنی دھوتی کے پلّو سے لکڑی کا کام نکالا اور دھیرے سے اسے مگن کے سامنے رول ٹاپ کی میز پر رکھ دیا۔ کیونکہ اوپر کے لیمپ کی روشنی وہیں مرکوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے مگن نے ایک بیروق کرسی کیرتی کے سامنے سرکا دی۔ مگر وہ بدستور کھڑی رہی۔

”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک بار پیچھے اس طرف دیکھا جہاں سڑک نیچے گرتی تھی اور جب چہرہ مگن کی طرف کیا، تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

کیرتی کی ماں وہیں چھاؤنی کے اسپتال میں پڑی تھی، جہاں اس کے باپ نارائن نے دم توڑا تھا۔ بڑھیا کو مقعد کا سرطان تھا۔ اس کے پیٹ میں سوراخ کر کے ایک نلی لگا دی گئی تھی اور اس کے اوپر ایک بوتل باندھ دی گئی تھی، تاکہ بول و براز نیچے جانے کے بجائے اوپر بوتل میں چلے جائیں۔ پہلی بوتل کسی وجہ سے خراب ہو گئی تھی اور اب دوسری کے لیے پیسے چاہیے تھے۔ اگر وہ مگن کو بتا دیتی تو وہ

شاید دوسرے طریقے سے بات کرتا، لیکن اس وُڈ ورک کو دیکھ کر وہ ویسے ہی بھڑک گیا تھا۔

"پھر وہی" اس نے کہا "میں نے تم سے کَے بار کہا ہے۔ آج کل ان چیزوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ لیٹے ہوئے وشنو، اوپر شیش ناگ۔۔۔ لکشمی پاوں داب رہی ہے۔۔۔"

کیرتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے مگن کی طرف دیکھا، جن میں سوال تھا۔۔۔ اور کیا بناؤں؟

"وہی۔۔۔ جو آج کل ہوتا ہے۔"

"آج کل۔۔۔ کیا ہوتا ہے؟" کیرتی نے آخر منہ کھولا۔ مشکل سے اس کی آواز سنائی دی، جیسے کینری (Canary) کی چونچ ہلتی دکھائی دیتی ہے، مگر آواز سنائی نہیں دیتی۔

مگن نے کچھ رُکتے، کچھ راستہ پاتے ہوئے کہا "اور کچھ نہیں ہوتا تو گاندھی ہی بناؤ، نہرو بناؤ۔۔۔" اور پھر جیسے اسے کوئی غلطی لگی اور وہ اپنے آپ کو درست کرتے

ہوئے بولا ”کوئی نیُوڈ۔۔۔“

”نیُوڈ؟“

”ہاں۔۔۔ آج کل لوگ نیوڈ پسند کرتے ہیں۔“

کیرتی چُپ ہو گئی۔ کنواری ہونے کے ناتے وہ شرما سکتی تھی، لجا سکتی تھی مگر یہ سب باتیں اس لڑکی کے لیے تعیش تھیں، اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ مگن اس کے وُڈ ورک کو خریدتا، پیسے دیتا ہے یا نہیں؟ کچھ سوچتے، رُکتے ہوئے اُس نے کہا۔۔۔ ”مجھے نہیں آتا۔“

”کیا بات کرتی ہو؟ تمہارے باپ نے بیسیوں بنائے۔“

”وہ تو۔۔۔ دیوی ماں کے تھے۔“

”فرق کیا ہے؟“ مگن ٹکلے نے کہا ”دیوی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ تم وہی بناؤ، مگر بھگوان کے لیے کوئی دیومالا اس کے ساتھ نتھی مت کرو۔ انہی حرکتوں سے ہی تو تمہارے پِتا ایسی موت مَرے۔۔۔ سرگباش ہوئے۔“

کیرتی نے اپنے جیون کے پچھواڑے میں جھانکا۔ اب جیسے وہ کھڑی نہ رہ سکتی

تھی۔ کسی اور خطرے سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، جسے وہی جانتی تھی، کوئی دوسرا نہیں۔ پھر بھی وہ بیروق کرسی پر بیٹھی نہیں، اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس طرف سے اس کے بدن کے حسین مگر جارحانہ خط دکھائی دے رہے تھے۔ کیا شلپ تھا، جسے اوپر کے نہیں، نیچے کے نارائن نے بنایا تھا۔ مگن لال کے دماغ میں اختیار اور بے اختیاری آپس میں نبرد آزما ہو رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ برابر والی لڑکی کے اندر بھی وہی چارہ اور لاچاری آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ اس کا منہ سوکھ گیا تھا۔ کوئی گھونٹ سا بھرنے کی کوشش میں وہ بولی۔

"میں۔۔۔ میرے پاس موڈل نہیں۔"

"موڈل؟" مگن نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا "سیکڑوں ملتے ہیں۔ آج تو کسی بھی جوان، خوب صورت لڑکی کو پیسے کی جھلک دکھاؤ تو وہ ایک دم۔۔۔"

کیرتی نے کچھ کہا نہیں۔ مگر مگن نے صاف سن لیا "پیسے؟" اور خود ہی کہنے لگا "آدمی پیسہ خرچ کرے، تبھی پیسہ بنا سکتا ہے نا۔"

اس بات نے کیرتی کو اور بھی اداس کر دیا۔ اس کی روح، زندگی کے اس جبر کے

نیچے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ عورت کا یہی عالم تو ہوتا ہے، جو مرد کے اندر باپ اور شوہر کو جگا دیتا ہے۔ چنانچہ مگن نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ اسے بازوؤں میں لے لے اور چھاتی سے لگا کر کہے۔۔۔ ”میری جان، تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں جو ہوں۔“ لیکن کیرتی نے اسے جھٹک دیا۔ مگن کٹ گیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تُرپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ رول ٹاپ پر سے اس نے وُڈ ورک کو اُٹھایا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“

جب تک کیرتی نے بھی کچھ سوچ لیا تھا۔ اس نے پہلے نیچے دیکھا اور پھر ایکا ایکی سر اوپر اُٹھاتے ہوئے بولی ”اگلی بار نیوڈ ہی لاؤں گی۔ ابھی تم اسے ہی لے لو۔“

”شرط ہے؟“ مگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیرتی نے سر ہلا دیا۔ مگن ٹکلے کا خیال تھا، کیرتی ساتھ ہنس پڑے گی مگر وہ تو کچھ اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے رول ٹاپ کو اُٹھایا اور میز کے اندر سے دس روپے کا چُرمُرا سا نوٹ نکالا اور اُسے کیرتی کی طرف بڑھا دیا۔۔۔ لو!“

”دس روپے؟“ کیرتی نے کہا۔

”ہاں تمہیں بتایا نا، میرے لیے یہ سب بیکار ہے۔ میں اور نہیں دے سکتا۔“

”ان سے تو۔۔۔“ اور کیرتی نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔ اس کے اندر گویائی، الفاظ سب تھک گئے تھے۔ پر مطلب صاف تھا۔ مگن سمجھ گیا ”اس سے تو بوتل بھی نہ آئے گی، دوا کا خرچ بھی پورا نہ ہو گا، روٹی بھی نہ چلے گی“ قسم کے فقرے ہوں گے، سب مجبور اور نادار جن کی تے کیا کرتے ہیں۔ اس نے کیرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے بس وہ لا دو تو میں اچھے پیسے دوں گا۔“

اور ایسا کہنے میں اس نے ہاتھ کی دو انگلیوں کا چھلّا بنایا، تھوڑی آنکھ ماری جیسی ڈوم، سازندے نائکہ کو داد دیتے ہوئے مارتے ہیں۔

کیرتی باہر نکلی تو اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، وہ تھوڑا ہانپ رہی تھی۔ لوٹنے پہ کیرتی ہمیشہ اُلٹی طرف سے جاتی تھی، حالانکہ اس میں اسے میل ڈیڑھ میل کا چکّر پڑتا تھا۔ وہ نہ چاہتی تھی سراج سے اس کی ٹکّر ہو، لیکن آج وہ اسی طرف سے گئی، جیسے اس میں کوئی مدافعت ابھر آئی تھی۔ مائیکل چلا آیا تھا اور سراج کے

ساتھ مل کر کچھ کھا رہا تھا، جب کہ کیرتی منہ اوپر اُٹھائے، ناک پھُلائے ہوئے پاس سے گزر گئی۔ سراج نے کچھ کہا جو مگن کو سُنائی نہ دیا۔ کیرتی میں وہ بغاوت ہی کا جذبہ تھا اور یا پھر وہ ان مصیبت زدہ لوگوں میں سے تھی، جو دشمن کے ساتھ بھی بنا کر رکھنے کی سوچتے ہیں، مبادا انہیں سے کوئی کام آ پڑے۔ شاید یہ عورت کی فطرت کا خاصا تھا جو اس مرد کو بھی اپنے پیچھے لگائے رکھتی ہے جس سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ صرف اس لیے کہ اسے دیکھ کر ایک بار اس نے سیٹی بجائی تھی، یا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھری تھی۔

سراجا ضرور کوئی ''ایفروڈیزیاک'' کھا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے پائے ہوں، جو مائیکل اس کے لیے لایا تھا۔ شاید وہ دونوں مل کر مگن ٹکلے کے پاس آتے اور اُسے کچھ داؤ گھات بتاتے، لیکن مگن نے دکان ہی بڑھالی تھی۔ دروازوں کو اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے کیرتی کے وُڈورک کو دیکھا جو بہت عمدہ تھا۔ شیش ناگ کا نچلا حصّہ تو خوبصورت تھا ہی لیکن اوپر کی چتکبری کھال میں اس نے صرف گودنوں سے رنگ بھر دیے تھے۔ وشنو بھی وہی تھا جو کوئی بھی عقیدت مند عورت کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ لکشمی ڈھیر سی پڑی تھی اور اس کے بدن کے خط واضح

نہ تھے۔ شاید کیرتی لکشمی کو اس کے کسی بھی معنی میں نہ جانتی تھی۔ حالانکہ اسے روچک بنانا کتنا آسان تھا۔ جب عورت پاؤں دبانے کے لیے جھکتی ہے تو ظاہر ہے اس کے ہاتھ بازو بدن سے الگ ہوتے ہیں اور مخصوص عورت صاف اور سامنے دکھائی دیتی ہے۔ پھر پہلو پہ بیٹھی ہوئی اوپر کی عورت، نیچے والی سے کتنی کٹ جاتی ہے اور مرد کی نظروں کو کیا کیا اونچ نیچ سمجھاتی ہے۔ اگر یہ کہیں، کیرتی خود عورت تھی اس لیے اسے عورت کی بہ نسبت مرد میں زیادہ دل چسپی تھی، تو یہ غلط ہو گا۔ کیوں کہ عورت اپنے حُسن کے سلسلے میں اوّل اور آخر تک خود پرست ہوتی ہے اور جب اس کی یہ خود پرستی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے، تو کسی بھی مرد کی مدد سے اسے جھٹک دیتی ہے۔

مگن نے کیرتی کے وُڈورک کو ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرے میں چاقو لے کر اس پر "سد ہم نمہ" کے الفاظ کندہ کر دیے اور پھر پچھلے کمرے میں پہنچ گیا، جہاں کچی زمین تھی، جسے کھود کر اس نے وُڈورک کو نیچے رکھا، ایک اور موتی کو نکالا جو کیرتی ہی کی بنائی ہوئی تھی اور پھر گڑھے پہ مٹی ڈال کر اس پر کتھے کا پانی چھڑک دیا۔ پرانے بُت کی مٹّی جھاڑ کر اُسے دیکھا تو بڑی بڑی دراڑیں اس میں چلی آئی

تھیں اور وہ صدیوں پُرانا معلوم ہو رہا تھا۔ اگلے دن جب وہ اسے لے کر ٹورسٹوں کے پاس گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ مگن نے انہیں بتایا کہ اس کا ذکر کالی داس کے رگھوونش میں آتا ہے۔ رگھو جی نے کونکن کے علاقے میں تُرکٹ نام کا ایک شہر بسایا تھا، جہاں سے یہ بُت بر آمد ہوئے۔ کچھ میسور کے چماراجہ وڈیار کے پاس ہیں اور کچھ اپنے پاس۔ چنانچہ اس بُت کو مگن ٹکلے نے ساڑھے پانچ سو روپے میں بیچ دیا، جس کے لیے اُس نے کیرتی کو صرف پانچ روپے دیے تھے۔

اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر کیرتی نیوڈلے آئی۔ وہ بدستور بدحواس تھی۔ اس کی ماں تو بیمار تھی ہی، وہ بھی بیمار ہو گئی تھی۔ اسے قریب قریب نمونیہ ہو رہا تھا۔ وہ کھانس رہی تھی اور بار بار اپنا گلا پکڑ رہی تھی، جس پر اس نے روئی کا لوگڑ ایک پھٹے پُرانے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

کیرتی نے معمول کے طرح سے شلپ کو مگن ٹکلے کے سامنے رکھا۔ اب کے اس نے اُسے لکڑی میں نہیں، پتھر میں بنایا تھا۔ اب وہ پھر امید و بیم کے ساتھ مگن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگن اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو بہت بڑا جھوٹ ہوتا۔ اس لیے اس نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ جی بھر کر داد دی۔ اعتراض تو صرف

اتنا کہ وہ بہت چھوٹا تھا۔ کاش وہ اسے قد آدم میں بناتی تو نہ صرف اسے بلکہ خود مگن کو بھی بہت فائدہ ہوتا۔

اس نے شلپ یکشی کو ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھا۔ کیرتی پھر بھی سچ مچ کا نیوڈ نہ بنا سکی تھی۔ بُت کے بدن پہ کپڑا تھا جو گیلا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اس کپڑے سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ کہیں تو بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کہیں علاحدہ۔ بظاہر چھپانے کے عمل میں وہ عورت کے جسم کو اور بھی عیاں کر رہا تھا۔

شلپ پر سے نظریں ہٹا کر مگن ٹکلے نے کیرتی کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''اوہ!'' کیرتی جھینپ گئی اور اس جامنی ساری کو آگے کھینچنے، پیچھے سے ڈھانپنے لگی لیکن مگن سب جان گیا تھا کہ وہ برہنہ ہو کر خود کو آئینہ میں دیکھتی اور اُسے بناتی رہی ہے، کے بار اس نے کپڑا بھگو کر اپنے بدن پر رکھا ہو گا، جس سے اُسے سردی ہو گئی اور اب وہ کھانس رہی ہے۔ یہ صرف پیسے ہی کی بات نہیں۔ عورت میں نمائش اور خود سپردگی کا جذبہ بھی تو ہے۔ مگن سب سمجھ گیا تھا مگر تجاہل برتتے ہوئے اس نے پوچھا۔۔۔ ''ماں کیسی ہے؟''

کیرتی جیسے ایک دم برافروختہ ہو گئی۔ اُسے کھانسی کا فِٹ سا پڑا اور خود کو سنبھالنے میں خاصی دیر لگی۔ مگن گھبرا گیا تھا اور شرمندہ بھی تھا۔ اس کے بعد سر ہلاتے ہوئے جو اس نے سوال کیا، وہ بہت غیر ضروری تھا۔۔۔ ”تو موڈل مل گیا تمہیں؟“

کیرتی نے پہلے تو نظریں گرا دیں اور پھر دکان سے باہر اس طرف دیکھنے لگی، جہاں سڑک آسمان کو چھوتی ہوئی ایکا ایکی نیچے گرتی تھی۔ مگن نے چاہا کہ اسے اس کمزوری کے عالم میں پکڑ لے اور وہ داد دے جس کی وہ مستحق تھی اور جو شاید وہ چاہتی بھی تھی مگر اس نے سوچا، ایسے میں دام بڑھ جائیں گے۔ اس نے اپنے دل میں اب کے کیرتی کو سو روپے دینے کا فیصلہ کیا۔ بوتل اور باقی کی چیزیں شاید سو کی نہ ہوں، مگر وہ سو ہی دے گا۔ اندر ہی اندر وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں کیرتی زیادہ کا مطالبہ نہ پیش کر دے۔

”کیا دام دوں اس کے؟“ اس نے یوں ہی سرسری طریقے سے پوچھا۔ کیرتی نے اُچٹتی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی ”اب کے میں پچاس روپے لوں گی۔“

”پچاس؟“

”ہاں۔ پائی کم نہیں۔“

مگن نے تسکین کے جذبے سے رول ٹاپ اُٹھایا اور چالیس روپے نکال کر کیرتی کے سامنے رکھ دیے اور بولا۔۔۔ ”جو تم کہو۔۔۔ مگر ابھی چالیس ہی ہیں میرے پاس۔ دس پھر لے لینا۔“

کیرتی نے روپے ہاتھ میں لے لیے اور کہا۔۔۔ ”اچھا۔“

وہ جانے ہی والی تھی کہ مگن نے اسے روک لیا۔۔۔ ”سنو“

کیرتی گِت کے بیچ تھم کر اس کی طرف ”مجھے تھام لو“ کے انداز میں دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پہ اُداسیاں چھٹ جانے کے بجائے کچھ اور کھنڈ گئی تھیں، جب کہ مگن ٹکلے نے پوچھا ”اتنے پیسوں میں تمہارا کام چل جائے گا؟“

کیرتی نے سر ہلا دیا اور پھر ہاتھ پھیلائے جس کا مطلب تھا۔۔۔ اور کیا کرنا۔۔۔؟ پھر اس نے بتایا۔ ماں کا آپریشن آ رہا ہے، جس کے لیے سیکڑوں روپے چاہئیں۔

”میں تو کہتی ہوں“ اس نے کہا اور پھر کچھ رک کر بولی ”ماں جتنی جلد مر جائے، اُتنا ہی اچھا۔“ اور پھر وہ کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ آخر وہ

خود ہی بول اُٹھی۔۔۔ ”ایسے ایڑیاں رگڑنے سے تو موت اچھی ہے۔“

جب مگن نے اس سے آنکھ نہ ملائی تو کیرتی اٹھارہ اُنیس برس کی لڑکی کے بجائے پینتیس چالیس برس کی بھرپور عورت نظر آنے لگی جو زندگی کا ہر وار اپنے اوپر لیتی اور اسے بیکار کر کے پھینک دیتی ہے۔

”ایک بات کہوں“ مگن ٹکلے نے پاس آتے ہوئے کہا ”تم مِتھُن بناؤ، آپریشن کا سب خرچا میں دوں گا۔“

”مِتھُن؟“ کیرتی نے کہا اور لرز اٹھی۔

”ہاں۔“ مگن بولا۔ ”اس کی بہت زیادہ مانگ ہے۔ ٹورسٹ اس کے لیے دیوانے ہوتے ہیں۔“

”لیکن۔۔۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ مگن نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”تم نہیں جانتیں تو ایک بار کھجوراہو چلی جاؤ، اور دیکھ لو۔ میں اس کے لیے تمھیں پیشگی دینے کو تیار ہوں۔“

”تم؟“ کیرتی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولی ”تم

تو کہہ رہے تھے، تمہارے پاس اور پیسے نہیں؟"

مگن نے فوراً جھوٹ تراش لیا۔۔۔

"میرے پاس سچّی پیسے نہیں۔" وہ بولا۔ "میں نے دکان کا کرایہ دینے کے لیے کچھ الگ رکھے تھے۔۔۔"

پھر اس نے پیسے دینے کی کوشش کی، مگر کیرتی نے اپنے زعم میں نہ لیے اور وہاں سے چلی گئی۔ مگن ٹکلے نے لوٹ کر "یکشی" کو دیکھا اور پھر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی لے کر اس کی ناک توڑ دی۔ پھر ایک بازو توڑا۔ پھر ٹانگ توڑی اور اس کے سر کے سنگار پر ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں، جس سے کچھ کھرچیں گریں۔ پھر اندر جا کر اس نے اسے رسّی میں باندھا اور نمک کے تیزاب میں ڈبو دیا۔ دھوئیں کے بادل سے اُٹھے۔ مگن نے رسّی کو کھینچا اور یکشی کو نکال کر پانی میں ڈال دیا۔ اب جو اُسے نکالا تو "یکشی" کے خدوخال دھندلے ہو گئے تھے اور کہیں کہیں بیچ میں سوراخ چٹاخ سے پڑ گئے تھے۔ اب وہ ہزار ایک روپے میں بِکنے کے لیے تیار تھی۔

اب کے کیرتی جو شلپ لائی وہ مِتھُن ہی تھا۔ اور قد آدم۔ وہ ایک بوری میں بندھا

ہوا تھا اور ٹھیلے پر آیا تھا۔ کچھ مزدوروں نے اُٹھا کر مگن ٹکلے کی دکان پر رکھا۔ پھر اپنی مزدوری لے کر وہ لوگ چلے گئے۔

کیرتی اور خود کو تنہا پا کر، تیز سانسوں کے بیچ مگن ٹکلے نے بوری کی رسّیاں کاٹیں، اور کچھ وارفتگی سے ٹاٹ کو شلپ پر سے ہٹایا۔ اب شلپ سامنے تھا۔ پرفیکٹ۔۔۔ مگن نے اسے دیکھا تو اس کے گلے میں لعاب سوکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیرتی اس کے سامنے اس شلپ کو نہ دیکھے گی مگر وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے، کسی بھی ہیجان سے عاری۔ شلپ میں کی عورت تکمیل (Orgasm) کو پہنچ رہی تھی، جب کہ مرد خود رفتگی کے عالم میں اُسے دونوں کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھا، جسے مگن ٹکلے نے توجہ سے نہ دیکھا۔ وہ شاید اسے فرصت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

”کتنے پیسے چاہئیں، آپریشن کے لیے؟“ اس نے پوچھا۔

”آپریشن کے لیے نہیں۔ اپنے لیے۔“

”اپنے لیے؟ ماں۔۔۔“

”مر گئی۔۔۔ کوئی ہفتہ ہوا۔“

مگن نے اپنے چہرے پہ دُکھ اور افسوس کے جذبے لانے کی کوشش کی، مگر شاید کیرتی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ ویسے ہی بھنچے ہوئے تھے۔ وہ ویسے ہی اُداس تھی جب کہ اس نے کہا ”میں اس کا ہزار روپیہ لوں گی۔“

مگن بھونچکا سارہ گیا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی، جب اس نے کہا۔ ”اس کے ہزار روپے بھی کوئی دے سکتا ہے؟“

”ہاں‘ کیرتی نے جواب دیا۔ ”میں بات کر کے آئی ہوں۔۔۔ شاید مجھے زیادہ بھی مل جائیں، لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔“

”میں تو۔۔۔ میں تو پانچ سو ہی دے سکتا ہوں۔“

‘نہیں“ اور کیرتی نے مزدوروں کے لیے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ مگن نے اسے روکا۔۔۔ ”سو ایک اور لے لو۔“

”ہزار سے کم نہیں۔“

مگن نے حیران ہو کر کیرتی کی طرف دیکھا جس کے آج تیور ہی دوسرے تھے۔

کیا وہ مجبور اہو گئی تھی؟ ٹورسٹوں سے ملی تھی؟ کسی بھی قیمت پہ کلاکار کو اس کی مارکیٹ سے جدا رکھنا چاہیے۔۔۔ مگر خیر۔۔۔ اس نے رول ٹاپ اٹھایا اور آٹھ سو کے نوٹ گن کر کیرتی کے سامنے رکھ دیے۔ کیرتی نے جلدی سے گِنے اور اس کے منہ پر پھینک دیے۔

میں نے کہانا۔ ہزار سے کم نہ لوں گی۔"

"اچھا۔۔۔ نو سو لے لو۔"

"نہیں۔"

"ساڑھے نو سو۔۔۔ نو سو پچھتّر۔۔۔" اور پھر کیرتی کی نگاہوں میں کوئی عزم دیکھ کر اس نے سو سو کے دس نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیے، اور نشے کی حالت میں مِتھُن کی طرف لپک گیا۔ کیرتی کھڑی تھی۔۔۔ جیسے وہ اپنے فن کی داد لینے کے لیے ٹھٹک گئی تھی۔ مگن نے مِتھُن میں کی عورت کی طرف دیکھا جو پھر کیرتی تھی۔ اس کی آنکھ میں آنسو کیوں تھے؟ کیا وہ لذّت کی گراں باری تھی یا کسی جبر کا احساس؟ کیا وہ دکھ اور سکھ، درد اور راحت کا رشتہ تھا جو کہ پوری

کائنات ہے؟ پھر اس نے مرد کی طرف دیکھا جو اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بے حد کثیف۔ کیوں، کیرتی نے کیوں مرد۔۔۔ انسان کی ”حماریت“ پہ زور دیا تھا؟۔۔۔ یہ مِتھّن ہے۔۔۔ مگر وہ مِتھّن تو نہیں، جو پُرش اور پرکرتی میں ہوتا ہے۔۔۔؟ ٹھیک ہے۔ اُلٹا زیادہ پیسے ملیں گے۔۔۔

مگن ٹکلے نے اوپر کی بتی کو کھینچ کر پھر مرد کی طرف دیکھا اور بول اُٹھا۔۔۔ ”یہ ۔۔۔ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔“

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

”تم۔۔۔“ مگن نے جیسے پتہ پاتے ہوئے کہا ”تم سراج کے ساتھ باہر گئی تھیں؟“

کیرتی نے آگے بڑھ کر زور سے ایک تھپّڑ مگن ٹکلے کے منہ پر لگا دیا اور نوٹ ہاتھ میں تھامے دکان سے نکل گئی۔

باری کا بُخار

مکانوں کے بلاک اور باڑیاں، بھُٹّے میں تپتی جلتی ہوئی اینٹیں ہو گئے، گھروں کے اندر پنکھے چل تو پوری اسپیڈ سے رہے تھے، لیکن اُس گرم اور چِپ چِپ ہوا کو چاروں طرف پھینک رہے تھے، جس سے بچنے کے لیے ہمہ شما نے دروازے بند کر رکھے تھے۔

سواتی کو یوں لگا، جیسے کسی نے اس کی باڑی کے کواڑ پہلے سہلائے اور تھپتھپائے ہیں۔ وہ کھُل کر بیٹھی تھی، اس عالم میں جس میں عورتیں کسی بھی ایکا ایکی چلے

آنے والے کو ڈانٹ دیتی ہیں۔۔۔ آتے تو آواز کر کے آتے؟۔۔۔ دیکھتے نہیں، گھر میں کبھی کوئی کیسے بیٹھا ہوتا ہے، کبھی کیسے؟ جلدی سے سواتی نے ساری بدن پر پھینکی۔ چابیوں کا گچھّا جو پلّو کے ساتھ بندھا تھا، کوڑے کی طرح بدن پہ پڑا، جس سے درد ہوا اور مزا بھی آیا۔۔۔ اوما گو! اس کے منہ سے نکلا اور پھر وہ دروازے کی طرف لپک گئی۔ تیز چلتی ہوئی وہ پیچھے سے بطخ معلوم ہو رہی تھی، جو کسی بلّی یا کتّے کے جھپٹنے کی وجہ سے پوکھر کی طرف بھاگی اُڑی جاتی ہے۔۔۔

باہر، اتنی گرمی پر بھی کوئی بھُورا، کالا کمبل لپیٹے کھڑا تھا اور ہُونگ رہا تھا۔ سواتی نے آدھے کھلے کواڑوں کے بیچ میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔۔۔ کون ہے؟

میں۔۔۔ ایک خلاصہ سی آواز آئی۔

پھر وہ پتلا سا، ڈرتا کانپتا، گرتا پڑتا ہوا باڑی میں گھسنے کے لیے بڑھا۔۔۔ اب گھر اور عورت ایک ہی بات ہے۔ دیکھے پرکھے بنا کوئی کسی کو کیسے اندر آنے دے؟

مجھے آنے دے، سواتی۔

۔۔۔ یہ آواز۔۔۔ پہلے بھی کہیں سُنی تھی، مگر اس پر بھی کوئی بھورے کالے کمبل

لپٹے ہوئے تھا۔

مجھے جُورَ آرہا ہے۔۔۔ بُخار!

سامنے، افیم چورستے پہ رکشا والے، رکشا کے بازوؤں پر گھنٹیاں مارتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کام کرنے والوں، مزدوروں کی شکل دنیا میں ہر جگہ ایک ہی سی ہوتی ہے، اس لیے یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے یہ لوگ گول گول بھوگول کے چکّر کاٹ کر پھر وہیں آ نکلے ہیں۔ ایسے ہی ٹھیلے، بمبو کاٹ اور گاڑیوں والے۔۔۔ انہیں لُو سے بھی بڑی کوئی آگ لگی تھی، ورنہ گھر کا سُکھ اور آرام چھوڑ کر یہ لوگ دوپہر کے وقت سڑکوں پہ نکل آتے؟ دراصل انہوں نے عورت کو محبت کی مار کے بدلے جو پیسہ دیا تھا، ختم ہو گیا تھا۔ اب اُلٹے دھکوں سے مجبور وہ باہر نکل آئے تھے۔۔۔ جاؤ۔ کماؤ اور مرو! گھر میں تب گھُسنے دوں گی، جب ہاتھ میں ٹکے ہوں گے۔

اور وہ سب بہکے بہکے، مارے مارے پھر رہے تھے۔ کچھ اور بھی محنت اور پسینے سے شرابور وہ دل میں انہی لوگوں کو گالیاں دے رہے تھے، جنہیں اپنی مرضی اور خوشی سے خود پہ سوار کر رکھا تھا۔ اس گلی میں تو وہ گھس ہی نہ سکتے تھے، کیونکہ

جگہ جگہ شہر کی حد باندھنے والی کارپوریشن نے 'نو اِنٹری' کے بورڈ لگا رکھے تھے۔

آدمی کا چہرہ کمبل سے باہر آتے ہی سواتی نے پہچان لیا۔۔۔ نبھ دا!

ہاں، یہ نبھ کرشن ہی تھے۔ وہی چہرہ۔۔۔ تانبے اور جست کا بھرت، جو غصّے سے ایک دم تپ اُٹھتا اور اسی سانس میں نُچڑ کر ٹھنڈا پیلا بھی پڑ جاتا، دھات فلزات کے سب قانون جھٹلاتے ہوئے۔ بچپن میں کسی ہمجولی نے جو غلیل ماری تھی، بھوؤں کے اوپر، بائیں آنکھ سے تھوڑا ملتا ہوا اس کا نشان ابھی تک دکھائی دے رہا تھا۔ آدمی بڑا ہو اور طاقت پکڑ لے تو بچپن کی مار کے سب داغ مٹ جاتے ہیں۔ لیکن نبھ کرشن پہ ٹوٹی ہوئی صحت کی قیامت اور برسی ہوئی سینتیس برساتیں اس داغ کو دھو مٹا نہ سکی تھیں۔ اُلٹا وہ پھیل کر ان کی شخصیت کا خاص نشان بن گیا تھا۔

نبھ کرشن کو پہچانتے ہی سواتی اپنے آپ سے گھبرانے لگی۔ اس نے دھوتی ساری کو تھوڑا اوپر کھینچا، لیکن اس پر بھی اس کا آپا باہر جھانکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ناٹے قد، سانولے رنگ کی ایک خوش شکل عورت تھی، جس کے بدن کو اس کے پتی نے جگا تو دیا تھا، لیکن سُلا نہ سکا تھا۔۔۔ یوں سواتی آکاش پہ تاروں کا ایک جھمکا

ہے۔ بتیس برس پہلے وہ دھرتی پہ کیسے چلا آیا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ اتنا ہی معلوم ہے کہ دھرتی سے بھی کچھ ستارے آکاش کو جاتے ہیں اور اس سنسار میں جتنے اچھے کام کیے ہیں، ان کے بدلے کا سکھ بھوگ کر پھر نیچے آتے، دھرتی کی کوکھ میں پڑتے اور جنم لیتے ہیں۔۔۔ مہا کوی ٹیگور بھی وہیں ہیں۔۔۔ اوپر جوڑا سانکھو کے آکاش پر۔ مگر ان کے آنے میں ابھی بڑے جُگ ہیں۔۔۔

''آپ؟'' سواتی نے کہا۔ ''بہو دی نہیں باڑی پر؟''

''نہیں۔

''کہاں گئی؟''

''گورُوکُل۔۔۔ پڑھانے۔''

''گورُوکُل میں۔۔۔ عورت!''

''عورت؟''

اور اپنی پتنی کی بات کرتے ہوئے نبھ کرشن نے جُور سے پٹی ہوئی ہنسی ہنس دی۔ اب رام جانے وہ ایک عورت کا مذاق اُڑا رہے تھے، یا دنیا بھر کی عورتوں کا؟۔۔۔

گورُوکُل سے ان کا مطلب لڑکوں کا اسکول تھا، البتہ، جہاں مادھبی، ان کی پتنی پڑھاتی تھی، وہ شہر سے اتنا دور تھا کہ ہفتے میں صرف تین دن وہاں بس جاتی تھی۔

یہی نبھ کرشن کبھی سواتی کے اپنے تھے۔ شریر سے اپنے، تو آتما سے بھی اپنے۔ شادی سے پہلے وہ کیسے گھر کے گربھ استھل تک گھُسے آتے تھے۔ سواتی ڈرتی، کانپتی، بے ہوش ہو جاتی تھی، مگر ان کے وجود سے ایک اپار آنند کا انوبھو بھی ہوتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ جیسے کسی نشے میں سو جاتی۔ جاگتی تو ہر کام کے لیے بھاگ کر پہنچتی، جہاں وہ چل کر بھی جا سکتی تھی۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ جیسے کہ ہوتا ہے۔۔۔ سواتی کو کمل بابو لے گئے اور نبھ کرشن کو مادھبی۔۔۔ نبھ اُن مردوں میں سے تھے جن کے لیے عورتیں براتیں لے کر آتی ہیں۔۔۔

اسی ہار اور ضد کی وجہ سے نبھ کرشن ''بڑے آدمی'' ہو گئے تھے۔ کلکتے کی تین ہزار سے اوپر ناٹک کمپنیوں میں سے نبھ دا کی ''لَوک بانی'' ہی تھی، جسے سب سے زیادہ عزّت ملی۔ ٹکے ملے بھی تو انہوں نے ساتھ کام کرنے والوں میں بانٹ دیے۔ خود یوں سکھی ہو گئے، جیسے آدمی جھڑ جانے کے بعد ہوتا ہے۔ ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ اشتوش باڑی، اپنے گھر چلے آئے اور اپنی پتنی سے وہ مار کھائی کہ پتی کی

مار بھی اس کے سامنے کیا ہو گی؟

نبھ دا لکھتے تھے اور ابھنے بھی کرتے تھے۔ جب لوگ انہیں پھولوں کے ہار پہناتے، تو وہ انہیں اُتار کر اپنے کھیل کی سندھیا رانی یا ناگ بھیم کے گلے میں پہنا دیتے اور کبھی اپنی پتنی مادھبی اس مان پر تیشٹھا میں شامل تو ہو جاتی، مگر اسے حاصل کرنے کے لیے کلاکار کو جو ِگرنا، اُٹھنا پڑتا ہے، اس کے لیے تیار نہ تھی۔۔۔ یہ تو سب اِن کا ہے، میرا کیا ہے؟ وہ ان عورتوں میں سے تھی، جو اپنے بچوں کے بارے میں بھی یہی کہا کرتی ہیں۔۔۔ سب ان کے ہیں، میرا کیا ہے؟۔۔۔ اس کے لیے اپنی قیمت بڑھانے، اپنا مول ڈلوانے کا اب کوئی راستہ نہ تھا، سوائے اس بات کے کہ وہ سب ایسی باتیں کرے، جو نبھ کرشن نہیں کر سکتے تھے۔ وہ شخصیت تھے، چلن نہیں۔ چنانچہ نبھ شخصیت ہوتے گئے اور مادھبی چلن پکڑتی گئی۔ اس نے گھر اور دھڑا دھڑ آنے والے پانچ بچّوں کی طرف اپنا دھرم سنبھال لیا۔ پوجا پاٹھ شروع کر دیے۔ کہاں وہ ہوٹل، چکن اور مٹن سے اِدھر بات ہی نہ کرتی تھی اور کہاں اب اس نے انڈہ میٹ تو ایک طرف، گھر میں مچھلی بھی گھسنے کی ممانعت کر دی۔ اب بھی جب وہ باہر سے آتی ہے تو اشتوش باڑی

کے پیچھے، پوکھر کی مچھلیاں پانی میں سے اُچھل اُچھل کر اُسے دیکھتی ہیں۔۔۔

اور نبھ کرشن گرتے پڑتے اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ ایک دن نُذرل نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور اپنے ہست اکھشروں سے "سندھو ہنڈول" کی کاپی دی۔ الیکشن لڑنے والے جانتے تھے کہ جیتنا ہے تو بھوانی پور کے نبھ کرشن کو ساتھ لے لو۔ اب معاملہ تھوڑا ٹھنڈا پڑ گیا تھا البتہ، کیونکہ نینی کے بازار میں بے شمار پارٹیوں نے دکانیں کھول لی تھیں اور منہ کے بھونپو بنا بنا کر، چلّا چلّا کر وہ اپنا اپنا مال بیچ رہے تھے۔ ٹاؤٹ لوگ تک بوکھلا گئے تھے اور نہیں جانتے تھے، اب کس پارٹی کا جھنڈا اُٹھائیں۔ ایک دن نبھ دا نے کہا بھی۔۔۔ مجھ سے کہیں کہ کون سی پارٹی اب جنتا کے لیے اچھی ہے، تو میں آپ سے پوچھوں گا، وہ سامنے دیوار پر بیٹھا ہوا کوّا نر ہے یا مادہ؟

"مجھے باری کا بخار ہے، سواتے۔"

"باری کا بکھار؟"

"ہاں۔۔۔ جو ایک دن چھوڑ کر آتا ہے۔"

"میں مر گئی۔" سواتی نے چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ لیکن ابھی تک وہ دروازے میں تھم گڑی تھی اور نبھ کرشن کو اندر آنے نہ دے رہی تھی۔

"تم نے دھُنیے کو نہیں دیکھا؟" نبھ بولے۔ "کیسے روئی کے پھوئیں اڑا دیتا ہے؟ بخار کے بعد ایسی حالت ہو جاتی ہے میری۔۔۔ آج پانچ بجے پھر باری ہے۔"

اب کے سواتی نے نبھ کرشن کی طرف دیکھا تو اس کے من میں ممتا چلی آئی۔ نبھ کہتے رہے۔۔۔ "اسے ہی ٹالنے کے لیے میں چلا آیا ہوں، تیرے دوار۔"

"ہیں (ہاں) نبھ دا!" سواتی نے انہیں، اور کچھ اپنے آپ کو سناتے ہوئے کہا۔ "وہ نہیں ہیں نا گھر پر۔ کھوکھی کے پِتا۔"

"کمل بابو؟۔۔۔ مجھے اس سے کیا لینا؟"

اور پھر کچھ دیر کے بعد بولے "تو نہیں آنے دے گی، تو میں یہیں گر جاؤں گا۔ چوکھٹ پر۔۔۔" اور پھر مری پٹی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "بیمار کے بھی کوئی لِنگ ہوتا ہے، سواتی؟"

سوال بدنامی کا تھا، جو ممتا سے بڑی ہے اور لِنگ سے بھی بڑی۔ وہ ایسی لُو ہے، جو

بدن ہی کو نہیں، دماغ کو بھی جھلس کے رکھ دیتی ہے۔ پروتیج (پرویز)، کمل بابو کے نائب کی عادت تھی، وقت بے وقت کمل بابو کا سندیس لے کر آدھمکنے کی۔ پھر پڑوس میں بھیشم باڑی کی کھڑکی میں اُڑیا کی رادھایوں نیچے دیکھ رہی تھی، جیسے ادڑ کے دنوں میں کِرشی لوگ اوپر میگھا پانی کے لیے دیکھتے ہیں۔

سب کچھ کیسے اوپر نیچے ہو گیا تھا۔۔۔ دھرتی، آکاش۔۔۔ سواتی، کمل۔۔۔ نبھ اور مادہبی۔۔۔

سواتی کے من میں سب پرانی یادیں لپک آئیں، جنہیں آدمی یوں دہرانا، کھانا چاہتا ہے، جیسے اگھوری لوگ مردہ کھاتے ہیں۔ لیکن اُڑیا کی رادھا کو دکھانے کے لیے سواتی نے دروازے کو کھُلا رہنے دیا، اور نبھ کرشن کو اندر آنے کا اشارہ کرتی ہوئی آپ باہر بھاگ گئی۔۔۔ بطخ پوکھر کی طرف بھاگی، اُڑی جارہی تھی۔۔۔

نبھ کرشن گرتے پڑتے باڑی میں داخل ہوئے، جب کہ اس کی مالکن خود باہر چلی گئی تھی۔ بھرتری ہری کے شرنگار شتک کی عورت کی طرح سے، جو ہوتی اپنے مرد کے بازوؤں میں ہے، لیکن سوچتی کسی دوسرے کے بارے میں ہے۔

اندر آکر نبھ کرشن نے کمبل کو بدن سے الگ کیا، جو انا کی طرح سے انسان کا پیچھا ہی نہ چھوڑ رہا تھا۔ پہلے تو انہیں اچھا لگا، لیکن فوراً ہی بعد ایک کپکپی آئی اور انہوں نے اسے دوبارہ اوڑھ لیا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ شاید اسی گھر میں انہیں پرانی محبت کے کوئی چیز نظر آجائیں۔ کوئی تصویر، کوئی مان پتر جو "لوک بانی" سے کبھی سواتی کو دیے تھے، جب وہ اُن کے کھیل میں چھوٹے چھوٹے، نٹ کھٹ سے رول کیا کرتی تھی، لیکن وہاں پرانی محبت کا تو ایک طرف، نئ کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ ایک تپائی پہ، صندل کے چوکھٹے میں چار پانچ سال کی ایک بچّی کی تصویر ضرور تھی، جو کھوکھی کی ہو گی۔۔۔ کوئی مزا لیتے ہوئے نبھ کرشن نے حساب لگایا۔۔۔ کھوکھی ضرور اب بارہ ساڑھے بارہ برس کی ہو گئی ہو گی۔۔۔

چھت کے کُنڈوں کے ساتھ لٹکا ہوا، گجراتیوں کے ہاں کی طرح کا ایک جھولا ہنڈولا تھا، جو بیٹھنے اور جھولنے کے بجائے گھر کی ہر آلتو فالتو چیز، حتیٰ کہ کوڑا کباڑ تک رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ سواتی تو بلّی کی طرح سے صاف اور ستھری رہتی تھی۔ اس کی ہر بات میں ایک قرینہ، ایک ادا تھی، پھر یہ سب کیا ہوا؟۔۔۔ پھر؟ کچھ بھی ہوا۔۔۔ بدن سے اُتارے اور اِدھر اُدھر پھینکے ہوئے کپڑوں میں

سے کل پرسوں کے پسینے کی باس آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسے کہ گھر کی مالکن اب کیچ اور غلاظت ہی کو پسند کرنے لگی ہے، اُس بھینس کی طرح سے جو دلدل میں لوٹ کر ہی تسکین پاتی ہے۔ اوپر پنکھے کی ہوا میں وہ کپڑے ہل رہے تھے۔۔۔ کبھی آہستہ، کبھی تیز تیز۔۔۔ دھوتیاں اور جُبّے ایک دوسرے میں یوں اُلجھے ہوئے تھے، جیسے رنڈیوں اور بھڑووں کی محبت۔ نیچے، دیوار کے ساتھ، ریلوے وٹینگ روم میں دکھائی دینے والی آرام کرسی اپنے لانبے لانبے بازو پھیلائے پڑی تھی۔ ناطاقتی کے احساس سے نبھ کرشن اس پر بیٹھ تو گئے، مگر پچھتائے۔۔۔ پچھتانے کے سوا اور رہئی کیا، اس دنیا میں؟ کرسی لیٹنے اور بازوؤں پہ اپنی ٹانگیں پھیلا دینے کے لیے کہہ رہی تھیں، مگر نبھ کرشن پرائے گھر میں ایسے بے تکلف نہ ہو سکتے تھے۔ اب وہ بیٹھے ہوئے تھے اور نہ لیٹے ہوئے۔ وہ صرف اس انتظار میں تھے کہ سواتی آئے اور انہیں اس ''آرام'' سے موکش دلائے۔۔۔

کھلے دروازے میں سے کلکتہ شہر کے خصیے نظر آرہے تھے۔ اس علاقے میں بلاک، باڑیاں اور پوکھر کسی نے بنائے تھوڑے ہی تھے۔ وہ تو ایک لفظ کُن سے ہو

گئے اور یا پھر اندر کی کسی بیماری، کسی تخمیر سے بنی، بڑھ اور پھول گئے تھے۔ ہائیڈروسیل کی طرح سے اور اب کلکتہ اپنے فوطوں کو تھیلی میں ڈال کر، کمر سے انہیں لٹکائے پھر رہا تھا، ٹکے بنا رہا تھا۔ کیسے بھی، کسی طرح سے بھی۔ ٹرانسپورٹ کا نیا ٹرک خریدا گیا۔ چونکہ پہلا ٹرِپ ہو گا اس کا، اس لیے بہت سی رسمیں ادا ہوں گی، جیسی جہاز کو سمندر میں ٹھیلنے پہ ہوتی ہیں۔ ڈھانچے پہ کاجو یا فینی شراب کی بوتل توڑی جاتی ہے، ناریل پھوڑے جاتے ہیں۔ پھر پوجا، پھول، مانگ میں سیندور۔۔۔ کیا کچھ نہیں ہوتا؟ آخر ایک بار رواں ہو جانے پہ کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ انجر پنجر ڈھیلے ہی رہیں گے۔ چرخی مُڑی تُڑی ہے تو مُڑی تُڑی ہی رہے گی۔ پھر کسی جانکار کی نظر پڑے گی تو۔۔۔

جبھی سواتی لوٹ آئی۔ اس کے ساتھ کھوکھی تھی۔

ماں کے کہنے پہ کھوکھی نے نبھ دا کو پرنام کیا اور آشیرواد لی۔ سواتی دیکھتی رہی۔۔۔ بھلا کہاں تک پہچانتے ہیں؟

نبھ کرشن نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"اب میں کھیلوں، ماں؟" کھو کھی نے کہا۔ جیسے وہ باہر، پوکھر کے پاس، سال کے پیڑ تلے کھیل رہی تھی کہ ماں اسے زبردستی گھسیٹ لائی۔

"ہیں۔۔۔ کھیلو۔"

کھو کھی کے ہاتھ میں چاک تھی اور ٹھیکری۔ اس نے زیادہ باتیں نہ کیں۔ وہیں فرش پر لکیریں کھینچ کر وہ ٹھیکری سے داؤ روڑا کھیلنے لگی۔ سواتی سے نظریں بچا کر نبھ کرشن نے کھو کھی کی طرف دیکھا، جو اب ایک ٹانگ کے بل کھڑی تھی اور کسی بھی وقت ٹھیکری کو ٹھوکر لگا سکتی تھی، لائن کے پار جا سکتی تھی۔

"کتنی بڑی ہو گئی!" نبھ دا نے مانتے ہوئے کہا۔ "کچھ اور برس، اور یہ آپ ہی اپنی ماں ہو جائے گی۔ اور پھر کیلنڈر پہ کسی پرانی تاریخ کو لگے دیکھ کر بولے۔ تاریخ تو بدل دو، نہیں تو ہم سب امر ہو جائیں گے۔"

سواتی نے نبھ کرشن کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ کھو کھی کے چلے آنے سے اسے کوئی رہائی سی مل گئی تھی۔ اب وہ نبھ کے ساتھ کھل کر بات کر سکتی تھی اور ان کے بیمار ہونے کے ناتے دیکھ ریکھ بھی۔ البتہ، اندر آتے ہوئے اس نے

دروازے کو کھلا رہنے دیا، مبادا۔۔۔

"کمبل اُتار دو، نبھ دا۔" اس نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر تو میرا اپنا بدن پھنکنے لگا ہے۔۔۔ او کالی ماں! کتنی گرمی ہے۔ پچھلے بارہ برس میں تو اتنی پڑی نہیں۔"

"کمبل اُتارتا ہوں تو سردی لگتی ہے۔" وہ بولے۔

"سر۔۔۔ دی؟"

"ہاں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کھاٹ ڈال کر بستر بچھائے دیتی ہوں اور خاشے کی ایک موٹی چادر دیتی ہوں، جس سے سردی نجیک بھی نہیں آئے گی۔۔۔ اوما گو، یہ کمبل تو پورا بھیگا ہوا ہے۔"

سواتی نے برآمدے کی طرف، دیوار سے لگی ہوئی کھاٹ اُٹھائی۔ اندر سے مرزا پور کا نیا خریدا ہوا کارپٹ نکالا اور بچھا دیا۔ پھر جلدی جلدی اس پر وہ تہی ڈالی اور پھر سفید، براق چادر اور پائنتی پہ خاشے کی اُجلی، موٹی چادر رکھ دی۔ نبھ کرشن نے ڈرتے ڈرتے کمبل اُتارا، لیکن اندر دھوتی اور جبّے کو دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا

تھا، جیسے کسی پوکھر کے پانی اور دلدل سے نکل کر آئے ہیں۔

وہ تو شاید کچھ نہ کہتے، لیکن سواتی نے ٹوک دیا۔۔۔ ''ٹھہرو۔۔۔'' وہ بولی، اور پھر کمرے کی طرف چلی گئی۔ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں اپنے مرد کی گنجی وغیرہ تھی اور دھوتی جُبّہ۔۔۔

اوپر کمرے میں جاکر بدل لیجیے۔ سواتی نے کہا۔

نبھ کرشن نے تھوڑا تامل کیا۔۔۔ ''نہیں، میں بیمار ہوں نا؟''

''تو یہ کس روگ کے دارو ہیں؟''

نبھ دا نے اپنا چہرہ پھر دوسری طرف کر لیا۔ ان کی صحت اب ذرا سی بھی مہربانی برداشت کرنے کی تاب نہ رکھتی تھی۔ جب تھوڑی دیر اور انھوں نے ہاتھ نہ بڑھایا تو سواتی کہنے لگی۔۔۔ ''بدل، نبھ دا! آپ کو میری سوگند لگے۔ پھر میں یہ دھو دوں گی، آپ والے۔۔۔''

نبھ کرشن نے اپنے کپڑے لیے اور اندر چلے گئے۔۔۔ وہ کانپ رہے تھے۔

سواتی نے جلدی جلدی چولھا جلایا۔ بیچ بیچ میں وہ کھوکھی کو کوئلے، دسپناہ قسم کی

کوئی چیز پکڑانے کے لیے کہتی، تو کھو کھی جھلّا اُٹھتی۔۔۔ ’’تم ہمیشہ میرا کھیل خراب کرتی ہو، ماں!‘‘

آخر سواتی نے کہا۔۔۔ ’’اور تم لوگوں نے، جو میرا کیا ہے ؟؛

کھو کھی نے ماں کی طرف دیکھا کہ کیا بک رہی ہے۔ پھر کچھ سمجھ میں نہ آنے سے وہ اپنے داؤ روڑے میں لگ گئی۔ بیچ میں وہ کبھی کبھی دروازے کے پاس جا کر باہر کی طرف جھانک لیتی تھی۔

کمرے سے نکلے تو نبھ کرشن کو اپنا آپ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جیسے کپڑے پہننے ہی سے وہ تھوڑا کمل بابو ہو گئے۔ جُملہ حقوق کے ساتھ ایسا نہ ہوتا تو سواتی کیوں ان کی طرف دیکھ کر شرماتی، نگاہیں نیچی کر لیتی ؟۔۔۔ آگ جل چکی تھی۔ سواتی نے پانی کی پتیلی چولھے پر رکھی اور اپنے آپ کو ساری کے پلّو سے ہوا دیتی ہوئی وہ آنگن کی طرف چلی گئی، جہاں ایک کٹگھرے میں تلسی کا پودا لگا ہوا تھا۔ اس نے تلسی کی پتیاں توڑیں اور جا کر پتیلی میں پھینک دیں۔ جب پانی کھولنے لگا تو اسے نیچے اتار کر سواتی نے اسی میں حاجیوں والی، اِنسٹنٹ چائے کی پوٹلی ڈالی دی۔

سواتی نے کیسے بستر بچھایا تھا، چادر پر کی ایک ایک سلوٹ نکال دی تھی۔ کس محبت سے تلسی کی چاۓ بنائی تھی۔ کیا وہ کمل بابو کے ساتھ بھی ایسے ہی کرتی تھی؟ کیا مادھبی کبھی بھی ایسا کر سکتی ہے؟۔۔۔ نبھ کرشن کھاٹ کے پاس جا کر اس پر لیٹ گئے اور کمبل کے بجائے چادر اپنے اوپر کھینچ لی۔ وہ اعتنا قسم کی بے اعتنائی سے گھر کے آکاش پہ سواتی کو چمکتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جبھی ان کے چہرے پہ کئی ورق اُلٹنے لگے اور اَن گنت تالیوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں، جو "لوک بانی" کے کام کے سلسلے میں پڑی تھیں۔۔۔ سواتی کے ساتھ، سواتی کے بغیر۔۔۔ اگر وہ ان کی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا؟۔۔۔ پھر اس عورت کی سخاوت کی وجہ سے ٹِکے بھی رہتے، جو اب مادھبی کے "سجگت" کی وجہ سے پارٹیوں، ہوٹلوں اور کوٹھوں کی راہ بنا رہے تھے۔

"لو نبھ دا۔۔۔ پی لو۔"

نبھ کرشن نے ہوش میں آتے ہوئے دیکھا۔۔۔ سواتی گرم گرم چاۓ کی کٹوری ساری کے پلّو میں تھامے کھڑی تھی۔ کمبل تو انھوں نے اُتار ہی دیا تھا۔ اب خاشے کی چادر نہ اُتر رہی تھی۔

"اس سے میرا ابخار جاتا رہے گا کیا؟" اُنہوں نے کہا۔

"ہیں۔۔۔ تلسی کی چائے تو برسوں کے روگ نکال دیتی ہے۔ پھر میں کالی مرچ اور دھنیے کا لیپ بناؤں گی۔ سِل بٹے پہ پیسوں گی، ماتھے پہ لگاؤں گی اور آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔" اور اس سانس میں کھو کھی سے بولی۔۔۔ "کھو کھی! کپڑے تو پانی میں ڈال۔"

"ماں!" کھو کھی نے بُرا سا منھ بناتے ہوئے کہا، اور کھیل چھوڑ کر کپڑے اٹھانے چلی گئی۔

"ان باتوں سے میرا کچھ نہ ہو گا۔۔۔" نبھ نے کہا۔

"آپ۔۔۔ پی کے دیکھیے۔"

"نا۔۔۔ نا۔"

"پینا پڑے گی۔۔۔" سواتی نے کچھ برہم ہوتے ہوئے کہا اور پھر جیسے پچکارتے ہوئے بولی۔۔۔ "پی بھی لیجیے نا، پھر مِشٹھی دوں گی۔۔۔"

اُچھو اور ہنسی نبھ کرشن میں مل گئے، جیسا کہ عمر زیادہ ہو جانے پہ ہوتا ہے۔ جبھی

جیسے بانہہ ڈال کر سواتی انہیں سہارا دینے، اُٹھانے لگی۔ نبھ آہستہ آہستہ حرکت میں آئے۔ اُٹھے۔ دو کانپتی ہوئی جانیں ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو گئی تھیں کہ نبھ کرشن کا سر، آنکھیں اور منہ سواتی کے بدن کے اُن حصوں کو چھو رہے تھے، جہاں ممتا اور نارِ تو ایک ہوتے ہیں۔ ایسے ہی سواتی کے ہونٹ نبھ دا کے اس نشان کو چھوتے ہوئے گزر گئے، جو بچپن ہی سے ان کے ساتھ تھا۔ کھوکھی کے دیکھنے سے وہ ایکا ایکی الگ ہو گئے۔ اب وہ ایک دوسرے سے یوجنوں دور تھے، ایک ایسی ہی ہی نیتی کے کارن، جس نے شونار بنگلہ کو دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔ دو گاؤں کے بیچ گنگا یا برہم پُتر کی لکیر اور کہیں نہ دکھائی دینے والا خط تھا، جسے پھاندنے پہ گولی لگتی تھی۔۔۔ اِدھر کی یا اُدھر کی۔۔۔

چائے پینے کے بعد نبھ کرشن پیچھے کی طرف لیٹ گئے۔ جہاں گھٹنے کی مدد سے سواتی نے دو تکیے سر کا دیے تھے۔ پھر وہ لیپ بنانے کے لیے سِل بٹہ ڈھونڈنے جا رہی تھی کہ نبھ دا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔۔۔ ''سواتے!''

''ہیں۔۔۔'' سواتی محبوبانہ انداز سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ کھوکھی پرے ٹب میں کپڑے کھنگال رہی تھی۔ بیچ بیچ میں چور آنکھوں سے وہ ان دونوں کی طرف

دیکھ بھی لیتی تھی، جیسے کچھ سمجھ رہی ہے، نہیں سمجھ رہی۔

"لیپ ویپ سے میرا کچھ نہ ہو گا۔۔۔" نبھ دا نے کہا۔ "باری کا بخار ٹوٹکوں سے جاتا ہے۔"

"ٹوٹکے؟۔۔۔ ٹوٹکے تو مجھے نہیں معلوم۔"

"کوئی کہہ رہا تھا، ایک کتھا سننے سے تئیا تپ چلا جاتا ہے۔"

"کیسی کو تھا؟۔۔۔ کون سُناتا ہے؟"

"یہاں کالی گھاٹ میں ہیں، کوئی اچاریہ جی۔۔۔ تم بھی سنا سکتی ہو۔"

"میں؟"

"ہاں۔۔۔ وہ سُنا دو، جب تمہارے پِتا مادھو داس کو ہماری محبّت کا پتہ چل گیا تھا اور انہوں نے جیسے کلف لگے ہوئے کپڑے پکڑ لیے تھے۔"

سواتی زور سے چِلاّئی۔ "کھوکھی! گھنٹے بھر میں تم دو کپڑے نہیں دھُلک سکتیں؟ کیا اس لیے پال پوس کے بڑا کیا ہے کہ ماں کا اتنا سا بھی کام نہ کرو؟" اور پھر جیسے نبھ

کرشن کا منہ بند کرنے کے لیے وہ بولی۔۔۔ ”وہ کوتھا میں نہیں سنا سکتی نبھ دا! جو ہونا تھا، ہو گیا۔ بھگوان جو بھی کرتے ہیں، اچھا ہی کرتے ہیں۔“

اور وہ پرے دیکھنے لگی۔

”ایک بات بتاؤ۔“ نبھ کرشن نے کہا۔ ”تم سکھی ہو، کمل بابو کے ساتھ؟“

”ہیں۔“ سواتی نے کچھ زیادہ ہی زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بیشی (بہت)۔۔۔ آپ اپنی کوتھا بولیے۔“

پھر وہ ایک پیڑھی سی گھسیٹ کر نبھ کرشن سے تھوڑا دور بیٹھ گئی۔ اس فاصلے کو دیکھ کر کھو کھی بے توجہ ہو گئی اور اپنے کام میں جُٹی رہی۔

کھلے دروازے میں سے افیم چورستے کے رکشا والے چکّر کاٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ سنائی دے رہے تھے۔ وہ بھاگ رہے تھے۔ جاگ رہے تھے۔۔۔ ٹکے ملیں گے۔۔۔ سالی خوش ہو گی۔۔۔ سالی بیوی نہیں ہوتی، مگر بیوی ضرور سالی ہوتی ہے!۔۔۔ ان میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اگلے ہی قدم پر وہ گر سکتا ہے، مر سکتا ہے، خواہ مخواہ لُو کا نام بدنام کرتا ہے۔ ہاتھ میں ٹکوں کی بجائے اپنے

دو نیبو رہ جائیں گے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لُو کا حملہ اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ایک حد کے بعد وہ لُو ہی کا حصّہ ہو جاتے ہیں۔ پھر لُو اور نیبو مل کر جو حملہ کرتے ہیں، اس سے کوئی اجمل خاں بھی نہیں بچا سکتا۔

نبھ کرشن نے سواتی کی طرف منہ موڑتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”تو نے کمل بابو کو بتا دیا تھا؟“

”کیا بتا دیا تھا؟“ سواتی بولی۔

”اپنا اور میرا!“

سواتی نے بے توجہ کھو کھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہیں، وُہی تو بھول ہوئی!“

”تو؟۔۔۔ وہ تم سے پیار نہیں کرتے؟“

”کرتے ہیں۔ پر جب نکٹ آتے ہیں تو جانے کیا ہوتا ہے۔۔۔؟“

”کیا؟“

”جیسے کوئی کوتھا بیچ میں آ گئی۔۔۔“

”کیسی کتھا؟“

سواتی چُپ رہی۔۔۔

”بولونا۔۔۔“نبھ کرشن نے ضد کی۔

”تم۔۔۔ بچپن میں جو ہوا سو ہوا۔ میں تو سب بھول کر اُن کی ہوتی ہوں، مگر وہ۔۔۔ میرے پاس نہیں ہوتے۔ ویسے سب کچھ ہوتا ہے، پر مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ کوئی اور ہیں اور میں۔۔۔ ہر بار وہ میرا اپتی برت توڑ دیتے ہیں۔“ اور سواتی جیسے رونے لگی۔

”وہ آپ پتنی برت ہیں؟“

سواتی ایکا ایکی خفا ہو گئی۔ اس نے نبھ کرشن کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اجنبی، کسی دشمن کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ اس کے دل کو ٹھیس پہنچا رہے تھے۔ چھت پر جو پنکھا چل رہا تھا، جیسے صدیوں پُرانا ہو۔ اس کی آواز جو پہلے سُنائی دے رہی تھی، اب شور مچانے لگی۔ نبھ دا نے پہلے دُور دیکھتے اور پھر نزدیک آتے ہوئے کہا۔

”میرا تو سرب ناش ہی ہو گیا۔“

”کیا کہتے ہو۔۔۔؟“ سواتی ایک ہی جست میں خفگی سے دل چسپی میں چلی آئی۔

”کھوکھے کھوکھیاں ہیں اور پھر۔۔۔بھودی۔۔۔“

”مادھبی؟۔۔۔اب کیا بتاؤں؟ تم جیسے جانتی نہیں، مادھبی کو۔۔۔“

”کیوں؟۔۔۔سندر ہے۔“

”سندر!“

”سچّی۔ نیم دھرم کی پکّی۔ پوجا پاٹھ کرتی ہے۔ مچھلی مانس کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ ہفتے میں کچھ نہیں تو دو بار دکشینشور جاتی ہے، جہاں وہ رام کرشن کو نہیں، ماں کو ماتھا ٹیکتی ہے۔ وہ تو دیوی ہے۔“

”نہیں چاہیے دیوی۔۔۔“ اور پھر نبھ کرشن نے سواتی کو ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں۔۔۔ ایسی باتیں کر کے تو میرے بخار کا علاج کر رہی ہے؟ جُبّے کے نیچے گنجی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ ”کیا آپ کو چاہیے، دیوی نہیں تو؟“

”عورت!۔۔۔ آدمی کتنا بھی شریف ہو، کتنا بھی ٹھنڈا ہو، لیکن ایک وقت تو آتا ہی ہے، جب اُسے عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ دیوی کے ساتھ بھی

سمبھوگ کر سکتا ہے کوئی؟"

"دھت۔۔۔" سواتی ساری میں منہ چھپاتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔۔۔" نبھ کرشن نے کہا۔ "بس وہ دن، وہ رات مادہی کی ہوتی ہے۔ وہ اپنا دیوگُن اور بھی اُبھار لیتی ہے۔ جیسے اسے میری ضرورت ہی نہیں۔ جب وہ مجھے یوں ذلیل کرتی ہے، جیسے میں انسان نہیں، جانور ہوں۔"

سواتی کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ بولی۔ "اس میں سب آپ کا دوش ہے۔"

"میرا دوش؟"

"میں۔۔۔ یہ تم ہی ہو، مرد لوگ، جو اچھی بھلی عورت کو دیوی بنا دیتے ہو۔"

"ہم بنا دیتے ہیں؟"

"ہیں۔۔۔" سواتی نے کہا۔۔۔ "تم لوگ آگ تو لگا سکتے ہو، بُجھانا بھی آتا ہے؟" اور پھر نبھ کرشن سے نظریں نچاتے ہوئے کہنے لگی۔۔۔ "میں تمہاری بات نہیں کرتی، مگر یہ بتاؤ، سوراتھ کے بنا کبھی گئے ہو اس کے پاس؟ اس کے پورا ہو جانے کے بعد اس کے اور پر تھم کے دنوں میں دھڑ دھڑ پیدا کیے ہوئے بچّوں کے

ساتھ رہے ہو؟“

”انہی سے چمٹے رہیں تو کام کون کرے؟“

”کام۔۔۔“ سواتی نے کہا اور سر ہلاتی رہی، جس کا مطلب تھا، میں سب جانتی ہوں، تم مردوں کے کام۔ وہ چاہتا ہے، یہ اسے ہر آن میں سمجھے۔ اُٹھتے بیٹھتے سمجھے، عیش کرے، جھک مارے تو۔۔۔ پھر اندر ہی اندر مزے لیتے ہوئے سواتی بولی۔۔۔ ”وہ بھی آپ ایسے کسی کلاکار کے ساتھ رہتی، تو دیوی ہو جاتی۔“

”سواتی!“

”دوسری جس کے پاس جاتے ہو، عورت نہیں؟“

”نہیں۔ وہ پشاچنی تو۔۔۔ کپڑے بھی اُتار لیتی ہے۔“

سواتی ایک دم کھکھلا کر ہنس پڑی، جیسے کوئی کسی بچّے کی بات پر ہنس دے۔ پھر وہ ہنسی کے بیچ ایکا ایکی رُک گئی۔۔۔ عورت کو اتنی بلند آواز سے نہیں ہنسنا چاہیے۔ کھوکھی نے گھوم کر ماں کی طرف دیکھا۔ اسے سب کتنا بُرا الگ رہا تھا۔

”تم ہنسیں کیوں؟“ نبھ کرشن نے پوچھا۔

"ایسے ہی۔۔۔" اور پھر ایک دم پیڑھی سے اُٹھتی ہوئی بولی۔ "اب تم دیوتا بننے کی کوشش مت کرو۔۔"۔ اور سواتی کے چہرے پر کوئی شرارت چلی آئی تھی۔

"دیوتا کیسے؟"

"ہیں۔۔۔ کپڑے اُتارے بنا بھی کوئی پیار کر سکتی ہے؟"

اور سواتی وہاں سے بھاگ گئی۔ رسوئی میں جا کر اس نے سِل بٹہ نکالا، پھر کالی مرچ دھنیا اور دوسرا انک سُک۔ تھوڑا پانی ملا کر وہ ان سب چیزوں کو پیسنے، ان کا لیپ بنانے لگی۔ وہ بٹہ سِل پر اتنے زور زور سے مار رہی تھی کہ نبھ کرشن کو بھی حیرانی ہوئی۔ اب وہ آنکھیں پونچھ رہی تھی۔۔۔ کالی مرچ تو آنکھوں میں نمی نہیں لاتی۔۔۔؟

"تم ناراض ہو گئیں، سواتی؟" نبھ دا نے پوچھا۔

جواب دینے کی بجائے سواتی نے صرف سر ہلا دیا۔

نبھ کہنے لگے۔۔۔ "یہ شادی ہئی بکواس۔۔۔ ہاں، مرد اور عورت کے بیچ مصیبت یہی ہے نا کہ بچّہ صرف عورت ہی کے ہو سکتا ہے۔ مرد بچّے اور اس کی ماں کی

ذمّے داری نہ لے تو عورت دو کوڑی کی ہو جاتی ہے۔ اُسے اس سے بچانے کے لیے مرد کے سر پہ ڈنڈا رکھا جاتا ہے۔۔۔ کبھی دھرم کا، کبھی قانون کا۔۔۔"

سواتی نے لیپ کٹوری میں ڈالا۔ اس کے کنارے سے دو انگلیاں رگڑیں اور پھر نبھ کرشن کی طرف دیکھا کہ اب اور کیا بکھان کرنے والے ہیں؟ اور اُنہوں نے کہا بھی۔۔۔ "ہر شادی اس بات کا ثبوت ہے کہ مرد ابھی مہذب نہیں ہوا۔"

سواتی نے شک کی نظروں سے نبھ دا کی طرف دیکھا، جیسے کوئی دشمن کی چال بھانپنے کی کوشش کرے۔۔۔ "یہ مرد۔۔۔ جب چاہیں اپنا دوش مان لیں اور جب چاہیں انکار کر دیں۔ یہ چھ آٹھ انچ کا غرور ان کا، کاٹ کے پھینک دیں تو رہ ہی کیا جائے ان کے پاس؟"

اُدھر نبھ دا کے من کی استیمتی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اگر قدرت، جس نے سُننے کے لیے دھیرے دھیرے کانوں کے چھاج، ریڈار بنا دیے ہیں، سُونگھنے کے لیے یہ لمبی ناک دی ہے، عورت کی مرضی اور اکڑ قائم رکھنا چاہتی تو اس کی جونی میں دانت نہ بنا دیتی؟

نبھ کرشن کے پاس پہنچ کر سواتی نے لیپ ان کے ماتھے پہ لگا دیا، جو ان کو بہت اچھا لگا۔

"ہا آ۔۔۔ہا آ۔۔۔" نبھ نے کچھ تسکین پاتے ہوئے کہا۔

پھر ایک لرزہ سا ان کے بدن میں دوڑ گیا اور وہ بولے۔۔۔ "چادر کھینچ دو، اوپر۔"

سواتی چادر کھینچنے کے لیے جھکی تو پھر اس کا جوبن سامنے تھا، جسے لنگ ہین آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نبھ کرشن نے کہا۔۔۔ "وہ کپڑوں والی بات۔۔۔ شریر کے کپڑے ہوتے ہیں، سواتی آتما کے نہیں۔"

اور پھر جیسے ہذیان بک رہے ہوں۔۔۔ "جب تک آتما اپنا سب کچھ اتار کر، پوری طرح سے ننگی ہو کر مانسر وور میں نہا کر اپنے مالک کے پاس نہیں جاتی، سویکار نہیں ہوتی۔ ہم سب آتمائیں ہیں استھول روپ میں۔۔۔ میں نے کمبل اُتار دیا ہے، چادر بھی ہٹا دیتا ہوں اور کمل بابو کے کپڑے بھی۔۔۔ اب آؤ سواتی۔۔۔"

کھوکھی کپڑے چھانٹتی ہوئی رُک گئی تھی اور کھُلے منہ سے 'اُس آدمی' کی باتیں سُن رہی تھی۔ سواتی لپک کر اس کے پاس پہنچی۔ جبّے کو دیکھا اور پھر سے اسے

نچوڑنے، کھوکھی کو ڈانٹنے لگی۔۔۔ یہ سِر ماں کا دھویا ہے؟ ابھی تک اتنا پانی ہے اس میں۔۔۔

کھوکھی نے کچھ نہ کہا۔ صرف فریادی نظروں سے دیکھتی رہی۔ گھر ہی تو وہ پاٹھ شالہ ہے، جس میں ہر لڑکی سبق سیکھتی ہے۔ اچھا لگے تو، بُرا لگے تو۔۔۔ آگے چل کر جانے زندگی میں کہاں مرنا ہے، کس کے بس پڑنا ہے؟۔۔۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی اور اس پہ کھُلے دروازے میں سے لُو کے جھونکے آرہے تھے اور افیم چورستے کا پورا شور، لیکن آگے ہونے کے باوجود، پسینے سے پٹے ہوئے وجود کو وہی لُو ٹھنڈی لگ رہی تھی اور ایک عجیب طرح کی راحت دے رہی تھی۔

جبھی دروازے کے پاس ڈرین پائپ پہنے ہوئے ایک لڑکا دکھائی دیا۔ اس کے بال آج کے فیشن میں ماتھے پہ گرے ہوئے تھے اور ٹی شرٹ میں اس کے بازوؤں کے کمائے ہوئے پٹھے نظر آرہے تھے، جن کو وہ شاید کبھی مل کر خرچ کریں گے۔ وہ ہماری مارا ماری کی قسم کا ہیرو دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ اوٹ میں ہو کر اس نے کھوکھی کو آنے کا اشارہ کیا۔ کھوکھی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اشارے ہی میں جواب دیا۔۔۔ آتی ہوں۔۔۔

لڑکے کے جاتے ہی کھو کھی نے کہا۔۔۔ ”دروازہ بند کر دوں، ماں؟“

”نہیں۔۔۔“ سواتی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ پھر وہ نبھ دا کے گندے، بیمار کپڑے کاندھے پہ ڈالے، انہیں الگنی پہ لٹکانے، سکھانے چلی گئی۔

چار سوا چار بجے کے قریب کمل بابو چلے آئے۔ جبھی سواتی نے ٹب کا پانی بالٹی میں ڈال کر باہر پھینکا، جو اُن پہ گرا۔ لیکن۔۔۔ حیرانی کی بات، وہ بھیگے نہیں۔ صرف ان کے منہ سے ایک موٹی سی، پان آلود گالی جھڑتی ہوئی دکھائی دی۔

ایسے موسم میں گھر کا دروازہ کھُلا دیکھ کر کمل بابو حیران ہوئے۔ اندر آئے تو نبھ کرشن کو صاف سُتھرے بستر پہ آرام سے لیٹے پا کر اور بھی حیران۔ لیکن پھر کھُلے دروازے اور کھو کھی کو دیکھ کر ان کی تسلّی ہو گئی۔

کھو کھی کے آتے ہی انہوں نے کہا۔۔۔ ”دروازہ بند۔“

کھو کھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے گئی۔ یہ ماں تھوڑی تھی جس کے سامنے وہ اوں آں کرتی۔

کمل بابو جہاد رائے کی شکل کے آدمی تھے۔ وُہی قد، وُہی کاٹھ، بات منہ سے نکل

کر پھیل جاتی تھی، البتہ اس کی وجہ ان کے برے دانت تھے اور پان، جو وہ کثرت سے کھاتے تھے۔ نبھ کرشن کو وہ بڑے تپاک سے ملے۔ خاص طور پر جب کہ انہیں پتہ چلا کہ نبھ دا کو باری کا بخار آتا ہے اور وہ ٹھیک سے اُٹھ بھی نہیں سکتے۔

سواتی، جو کمل بابو کے پیچھے، دروازے کی طرف سے آئی تھی، بولی، "کیا پئیں گے؟ کھائیں گے کچھ؟۔۔۔ کہیں تو نیبو پانی بنا دوں؟۔۔۔ ہئی، کتنی گرمی ہے۔ دھنیہ ہیں مرد لوگ جو باہر اتنی گرمی اور لُو میں کام کرتے ہیں اور ہم یہاں گھر میں بیٹھی رہتی ہیں مجے سے۔ ایک ٹھو چائے؟۔۔۔"

کمل بابو نے ڈانٹ دیا۔۔۔ "تھوڑا دم تو لینے دو کہ آتے ہی پیچھے پڑ جاتی ہو۔"

اس پہ سواتی پاس کھڑی انہیں پنکھا کرتی رہی، حالانکہ وہ چھت پہ پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ اور پھر جب اپنی ساری کے پلّو سے سواتی نے ان کی گردن پر سے پسینہ پونچھنا چاہا تو انہوں نے اسے پرے دھکیل دیا۔۔۔ سواتی ذرا بھی شرمندہ نہ ہوئی۔ یہی بات اگر نبھ دا ایسا آدمی کرتا تو وہ کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتی۔

وہ صرف اندر چلی گئی۔

کمل بابو نے اُٹھ کر کونے میں پان کی پیک پھینکی اور کُرتا اتارتے ہوئے نبھ کرشن کے پاس لوٹ آئے۔۔۔ بیٹھے تو صحت مبارک کی آواز سے پوری باڑی گونج اٹھی، جس کے بعد وہ بے جھجک بولے۔۔۔ ''سناؤ نبھ دا، آج دُور کے گھر کیسے چلے آئے بھگوان؟''

بیچ میں کھوکھی آگئی۔۔۔ ''باپی، میرے لیے سوندیس لائے؟''

''ارے جا سوندیس کی بچی۔۔۔'' کمل بابو نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔۔۔ ''میرا نیا ٹرک فیل ہوگیا ہے اور تجھے سوندیس کی پڑی ہے۔''

کھوکھی رونے، ماں کی چھاتیاں ڈھونڈنے کے لیے اندر چلی گئی۔ نبھ دا کی مجبوری جان کر کمل بابو بہتیرے خوش ہوئے اور ان کے لیے جان بھی حاضر، کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ بیچ میں اُڑیا کی رادھا اِدھر اُدھر جھانکتی ہوئی چلی آئی۔ آج سب کچھ گویا اتفاق ہی سے ہو رہا تھا۔۔۔ اتفاق ہی سے اس کے گھر میں نمک ختم ہو گیا تھا۔ کمل بابو کو دیکھ کر اس کی تسلّی ہو گئی۔ دو مردوں کو وہاں پاکر وہ ٹھٹک جانا چاہتی تھی۔ اس کے اندر بھی فاسفورس اور مچھلیاں تڑپ رہی تھیں، لیکن کمل بابو نے اسے ہنکار دیا، یہ کہہ کر۔۔۔ ''یہاں تیرے مطلب کا کچھ نہیں،

رادھی۔۔۔ ”مزے کی بات کہ اُڑیا کی رادھا کو بھی کمل بابو کا یہ فقرہ برا نہ لگا۔ جان بوجھ کر اپنی چال بگاڑتی، پیچھے کی طرف دیکھتی ہوئی وہ چلی گئی۔ پھر پرویز ٹرک کے ٹھیک اور 'نوبرنو' ہونے کی خبر دینے چلا آیا۔

”میری چیز لایا؟“ کمل بابو نے پرویز سے پوچھا۔

پرویز نے سر ہلا دیا اور جیب کے اندر سے ایک تبتی ڈبیا نکال کر کمل بابو کو دے دی، جو انہوں نے کھدر کی گنجی کے اندر چھوٹی سی پاکٹ میں رکھ لی۔

”اچھا، تم جاؤ۔۔۔“ کمل بابو نے پرویز کو ٹالتے ہوئے کہا۔۔۔ ”ہاں دلاّل قسم کے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ایک بار راستہ سیدھا ہو گیا تو پھر تو کون، میں کون؟“

اور پھر وہ نبھ دا سے میٹھی میٹھی، پیاری پیاری باتیں کرنے لگے۔ رقیبوں میں دوستی ہو گئی تھی، کوئی مذاق تھوڑے تھا! بیچ بیچ میں کمل بابو کے منہ سے پان کی پھوہار نبھ کرشن پہ پڑتی تھی۔ وہ انہیں بری نہیں لگ رہی تھی اور یا پھر مجبوری تھی محض۔۔۔ یہ بات بھی تو درست تھی کہ نبھ کرشن بڑے کام کے آدمی تھے۔

حکومت کے منسٹر ونسٹر سب انہیں جانتے تھے اور ان کی بہت عزّت کرتے تھے۔ یہ تو کمل بابو کی خوش قسمتی تھی کہ آج وہ ان کے ہاں پدھارے۔

نبھ دا کی بیماری کے سلسلے میں کمل نے بیسیوں ہی نسخے گنوائے، لیکن بخار کی اصل وجہ گرمی بتائی۔ پھر آنکھ مار کر بولے۔۔۔ ”جب تک اسے نکالیں گے نہیں، نبھ دا، آپ ٹھیک نہیں ہوں گے۔“

نبھ کرشن نے ایک روکھے پھیکے انداز سے مسکرا دیا۔

”آپ اشارہ تو کیجیے۔۔۔“ کمل کہتے رہے۔

نبھ کو زیادہ متوجہ نہ پا کر کمل بابو سندھیا کی باتیں کرنے لگے، جو ان کے کھیل 'لوک بانی' میں کام کرتی تھی۔

”اس کی تو بات ہی نہ کرو، کمل بابو۔۔۔“ نبھ کرشن نے کہا۔۔۔ ”وہ کُتّیا ہے۔“

کمل نے قسطوں میں ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ ”کون عورت کُتّیا نہیں ہوتی؟“

کرشن کانپ گئے۔ لیکن سواتی کہیں دور اندر تھی۔

کمل بابو جاری رہے۔۔۔ ”کبھی کُتّیا کو عورت کہہ کے دیکھو۔ پھاڑ کھائے، ٹانگیں چیر دے آدمی کی۔۔۔“

اور پھر بولے۔ ”میں اسے ملوں گا نبھ دا، کیا لڑکی ہے۔ تمہارے کھیل میں جب وہ ’میگھ دوت‘ کی نائکہ بنتی ہے تو صاف پتہ چلتا ہے، اُسے ماہواری آ رہی ہے۔۔۔ ایک ٹھوپان لیں گے؟“

”نہیں۔“

کتنی ایکسائٹنگ معلوم ہوتی ہے، جب وہ دونوں پاؤں ایک دوسرے سے تھوڑا فاصلے پہ رکھتی ہے۔ باپ رے باپ۔۔۔“ اور پھر نبھ کرشن کے کان کے پاس اپنا منھ لے جاتے ہوئے کہنے لگے۔۔۔ ”ایک بات بتاؤں، نبھ دا؟“

نبھ کرشن نے شکل ایسی بنالی، جس کا مطلب تھا۔۔۔ اب بتاؤ؟

کمل نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر کرسی سرکاتے ہوئے اور بھی قریب آ گئے، اور بولے۔۔۔ ”میں تو جب سواتی سے لَو میکنگ کرتا ہوں، تو میرے بچار میں سندھیا ہی ہوتی ہے۔۔۔“ اور پھر وہی قسط وار ہنسی!

نبھ کرشن نے کمل بابو کی طرف دیکھا اور پھر سامنے کھونٹی کی طرف، جہاں ہائیڈروسیل کی دوسری تھیلی سوکھ رہی تھی۔ انہیں گھِن سی آئی اور منہ پھیرتے ہوئے وہ تکیے کے سہارے پیچھے کی طرف لیٹ گئے۔ جبھی کمل بابو نے پانی مانگا اور جیب سے ڈبیا نکالی۔ جب کھوکھی پانی لائی تو کمل بابو ایک گولی نکال کر پانی کے ساتھ نگل گئے۔

جب پانچ بجنے میں دس منٹ رہ گئے تو نبھ کرشن نے ایکاایکی اُٹھ کر اپنا ہاتھ کمل بابو کی طرف بڑھایا اور بولے۔۔۔ "دیکھو کمل بابو مجھے جَور ہے؟"

کمل نے کسی بہت بڑے وید حکیم کی طرح سے نبض پہ ہاتھ رکھا۔ یہی نہیں۔ بایاں ہاتھ باقاعدہ اپنے کولہے پہ رکھ کر تھوڑا جھکے، کان نبض کے ساتھ لگایا اور کہنے لگے۔۔۔ "نہیں تو؟"

سواتی اندر سے لپکی آئی اور نبھ دا کا ہاتھ چھوتے ہوئے بولی۔۔۔ "نہیں تو، بکھار آپ کے دشمنوں کو ہو۔۔۔" پھر اس نے بلا جھجک اپنا ہاتھ نبھ کرشن کے پنڈے پہ دوڑنے دیا۔ ہاں، اب کیا تھا؟ اس کے اپنے پتی کمل بابو پاس بیٹھے تھے اور یوں پوری رہائی تھی۔ سواتی کا ہاتھ بدن پہ آتے ہی نبھ کرشن پہ سکتہ طاری ہو گیا۔

”وہ آیا ہو گا۔“ انہوں نے کہا۔

”کون؟“ سواتی اور کمل بابو نے ایک ساتھ پوچھا۔ کھوکھی ان دونوں کے بیچ میں سے اپنے چچا یا تاؤ کو دیکھ رہی تھی۔ ”

”باری کا بخار۔“

”کہاں؟“ سواتی بولی۔

”امار باڑی۔۔۔ اشتوش باڑی۔“

اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے نبھ کرشن کہنے لگے۔ ”اب وہ گھر کے سامنے کھڑا ہو گا۔۔۔ اب دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو گا۔ مگر دروازوں کا کیا ہے؟ وہ تو سوکھم ہے، دیواروں میں سے بھی اندر جا سکتا ہے۔“

سواتی نے ہاتھ کھینچ کر اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی پہ رکھ لیا اور منہ کھول کر نبھ کرشن کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب اس نے اندر جھانکا ہو گا۔۔۔ میرا بستر خالی پایا ہو گا، کہاں گیا میرا شکار؟ اب میں کیا کروں؟ کسے ڈھونوں؟“

پھر بستر سے اُٹھ کر دنیتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔۔۔ ”اسے ہر روز ایک پائینٹ خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے خون کا گروپ آر، ایکس ہے، جو بہت کم ملتا ہے، اور اس کے خون کا بھی۔ جبھی وہ میری جان نکالتا، مجھے ہی نچوڑتا ہے۔۔۔ لیکن آج۔۔۔ آج وہ بھوکا پیاسا ہی رہے گا۔ میں یہاں چلا آیا ہوں نا۔۔۔ تمہارے ہاں۔ اسے کیا معلوم، کدھر بھاگ گیا میں؟ نہیں نہیں، اس نے تو سِدّھی پراپت کر رکھی ہے۔ آنکھیں بند کرے گا تو جان لے گا۔۔۔ دروازہ بند ہے نا؟“

کمل بابو ہنسی کے بیچ رُک گئے۔ سواتی نے کچھ اور بھی دم سادھ لیا۔۔۔ ”اوما گو! یہ تو پاگل ہو گئے۔۔۔“ جبھی نبھ کرشن نے ہاتھ بڑھا کر سواتی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے اپنے سینے پہ رکھ لیا۔ سواتی نے کمل بابو کی طرف دیکھا، جنہوں نے اشارے سے کہا۔۔۔ ”پڑا رہنے دو، ہاتھ کا کیا ہے؟“

”جُورَ آ رہا ہے۔۔۔“ نبھ کرشن ایک دم ہنکارے۔۔۔ ”وہ آ رہا ہے، اِدھر ہی آ رہا ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے، دادا؟“ کمل بابو نے پوچھا۔

”مجھے؟“ نبھ نے ابھی سے ہانپتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”کوبھی ایک طرح کی سِدّھی مل جاتی ہے۔ مجھے وہ دکھائی دے رہا ہے۔ وہ دیکھو۔۔۔ بالی گنج سے آنے والی بڑی سڑک پہ وہ۔۔۔ وہ افیم چورستے پہ پہنچ گیا۔۔۔ اب اس گلی کی طرف مُڑا ہے۔“

جبھی دروازے پہ دستک آئی۔

سب نے اسے کانوں کا دھوکا سمجھا۔ دوبارہ دستک آنے پہ سواتی نے کھوکھی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔

”مت کھولو۔۔۔“ نبھ دا چلّائے۔

لیکن جب تک کھوکھی دروازہ کھولنے اور پھر سے بند کرنے کے جتن میں تھی، مگر آنے والا دروازہ دھکیل کر اندر چلا آیا۔۔۔

وہ مادہبی تھی۔

مادہبی ایک سفید، بے داغ ساری میں ملبوس تھی۔ معلوم ہوتا تھا، وہ بیماری کی حد تک صفائی سے محبت کرتی تھی۔ جیسے کہیں سے گندے پانی کا چھینٹا بھی پڑ گیا تو وہ حاملہ ہو جائے گی۔ اس کے چہرے پہ ایک تیج تھا، جو اندر کے غصّے کی وجہ سے اور

بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ خوب صورت تھی اور دیوی لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سواتی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ لیکن دیوی کی نظروں سے کچھ نہ بچ سکتا تھا۔ اس نے دیکھا، سواتی کا پتی پاس کھڑا ہے اور کھو کھی بھی ہے۔ اس کی بھی تسلّی ہو گئی۔ مگر ایکا ایکی کوئی پر چھائیں سی اس کے چہرے پر سے گزری۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟ اس شہر میں جو بھی ہو جائے، ٹھیک ہے، پورپ اور پچھم یہیں ملتے ہیں نا۔

مادہبی نے کسی کو نمسکار کی نہ پرنام۔ اس نے تو کھو کھی کے سر پہ بھی پیار سے ہاتھ نہ پھیرا۔ وہ سیدھے نبھ کرشن کے پاس آئی اور بولی۔۔۔ ''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔۔۔'' نبھ کرشن نے جواب دیا۔

کہاں نبھ کرشن ہذیان بک رہے تھے اور کہاں اب انہیں چُپ سی لگ گئی۔ جواب دیتے بھی تو یوں جیسے مشین میں دس پیسے ڈالے اور کھٹ سے ٹکٹ باہر۔ ان کے ماتھے کی سب ریکھائیں سیدھی ہو گئیں اور وہ منتر مگدھ مادہبی کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ وہ دور، اندر سے اس عورت کی قناعت، عفّت اور پاکیزگی سے محبت کرتے تھے؟

کچھ دیر ایسے ہی دیکھتے رہنے کے بعد نبھ بولے۔۔۔ ''اکیلا تھا، چلا آیا۔ پہلے میں اکیلا رہ لیتا تھا، اب پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ اندر سے کوئی ہول اُٹھنے لگتا ہے اور میں اپنے آپ کے ساتھ کیا کرنے لگتا ہوں۔۔۔ شاید بوڑھا ہو گیا ہوں۔۔۔''

پھر اپنے سامنے برف کے تودے کو دیکھتے ہوئے نبھ کرشن نے پوچھا۔۔۔ ''تمہیں کیسے پتہ چلا، میں یہاں ہوں؟''

''میں سب جانتی ہوں۔۔۔'' مادہبی نفرت سے بولی۔۔۔ ''کیا تم سوتے، بڑبڑاتے نہیں؟'' آخر کچھ اور بھی کبیدہ ہو کر کہنے لگی۔۔۔ ''تم جانتے ہی تھے، آج میری سالگرہ ہے۔ بچّے بھی پہاڑ پر سے لوٹنے والے ہیں۔ اس پہ بھی تم چلے آئے یہاں، دوسرے کے ہاں۔۔۔؟''

''یہ دوسرا گھر نہیں ہے، بہو دی۔'' کمل بابو نے کہا۔

مادہبی کمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔۔۔ ''دوسرا نہیں، سو واں، ہزارواں ہے شاید۔۔۔ یہ رہ ہی نہیں سکتے نا۔''

جبھی نبھ کرشن کو دیکھ کر مادہبی کے دل میں کوئی شک پیدا ہوا، اور اس نے

پوچھا۔۔۔ ”تم نے پی ہے ؟“

”نہیں۔۔۔ہاں۔۔۔“

”خوب سگریٹ اُڑائے ہوں گے ؟“

نبھ کرشن نے سواتی کی طرف دیکھا، جو بولی۔۔۔ ”نہیں، بہو دی!“

”یہاں آئے ہیں، جب سے تو نہیں۔“

”چلو اپنے گھر۔۔۔“ مادہبی نے تحکمانہ انداز سے کہا۔

”گھر؟“ نبھ کرشن نے کچھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ ”وہ تو مندر ہے!“

آخر، سواتی کی طرف دیکھتے ہوئے، کمل بابو کے سہارے نبھ کرشن بستر سے اُٹھے، کہتے ہوئے۔۔۔ ”پانچ بج گئے، میں نے کہا نہیں تھا؟ میں کپڑے بجھوا دوں گا۔ جو دینے آئے گا، اس کے ہاتھ میرے بھیج دینا۔“

سواتی اندر سے نبھ کرشن کو کمبل لوٹانے کے لیے لے آئی۔ اس نے ساری کا پلّو منہ میں ٹھونس رکھا تھا، جب کہ نبھ دا نے کہا۔۔۔ ”میں جا رہا ہوں، سواتی!“

سواتی انہیں جاتے دیکھتی رہی۔ جبھی کھلے دروازے میں سے لُو کا ایک تیز سا جھونکا آیا، جس نے سب کی روح تک کو جھلس کے رکھ دیا۔ نبھ کرشن مادھوی کے ساتھ نکلے تو پیچھے کھوکھی بھی چلی گئی۔۔۔ پوکھر کے پاس اپنا داؤ روڑھ کھیلنے۔۔۔

سونفیا

سونفیے کی خوشبو گاڑھی دھند کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آم کے اس قسم کے بیسیوں پیڑ تھے، جو گور پرساد نام کے اس بنگلے میں لگے ہوئے تھے۔ کتا گھاس اور ڈاھلیا وغیرہ سے تو کیا ہوتا، موگرے اور گارڈینیا کی خوشبو بھی سونفیے نے دبادی تھی، ایسے ہی جیسے لیلا مانک کی جوانی نے مندر کے بھجنوں کی قدر گھٹادی تھی۔

یہ آم کی اس تیز تر خوشبو ہی کی وجہ سے تھا کہ مکندی نے اچھی بھلی بھگوان کی اس

لیلا کا نام سونفیا رکھ دیا تھا، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی ماں کا بیٹا بنگلے سے فرلانگ بھر ادھر ہی (اپنی) چھاتی پر ہاتھ رکھ کہ کہہ دے کہ سونفیا اس وقت گھر ہی پہ ہے۔ جن مردوں کی ناک کے بالوں میں عورت کی بو سے کھجلی نہیں ہوتی، وہ تو قرائن ہی سے کہتے تھے۔۔۔ مثلاً یہ کہ سونفیا کا ریلے سائیکل برآمدے میں اپنے اسٹینڈ پر کھڑا ہے اور اس کا پچھلا پہیہ بودھ لوگوں کے تقدیر کے چکر کی طرح اپنے آپ ہی دُھرے پہ گھومتا جا رہا ہے، اس کی ٹیلی فنکن میں کہیں کرناٹکی سنگیت کا بکرا ذبح ہو رہا ہے اور یا پھر اُتر پچھم کی طرف اس کے کمرے کی خس تھوڑی اٹھی ہوئی ہے، البتہ بلائینڈ کھنچے ہوئے۔۔۔

شام کے پانچ بجے تھے۔ لُو ابھی تک زوروں پر تھی۔ پرماتما تو جیسے اپنا کرم دھرم ہی بھول گیا تھا اور مانس کے بدن پر سے کھال کھینچ کر نرمتا سے اسے کسی نمک کی کان میں دھکیل رہا تھا۔ اَن گنت باریک باریک سے اگنی بان تھے، جو بدن کے پور پور میں دھنسے جا رہے تھے۔ وہ دراصل ریت کے چھوٹے چھوٹے ذرّے تھے، جو لُو کے ساتھ دریا کی طرف سے اُڑ اُڑ آتے تھے اور جسم میں پیوست ہو جاتے تھے۔ گری لال، مکندی کے دوست، نے کہا بھی تھا کہ لُو تھم جائے گی تو چلیں

گے، لیکن مکندی ڈرتا تھا کہ لُو کے تھمتے ہی سونفیا دریا کی طرف نکل جائے گی، جہاں ایسے بھبھاکاسے موسم میں پھر تھوڑی تسکین کی ہوا چلتی ہے۔ دریا کا جوبن ماتا حصہ چھوڑ کر، اس جگہ پہ جہاں پانی چھوٹے چھوٹے پوکھروں اور نالیوں میں بٹ جاتا ہے، انسان اور حیوان ایک ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں۔ کتّے اپنے عضو، اپنے خصیے اور پیٹ پانی میں ڈبو کر، بڑی بڑی زبانیں باہر نکالے ہانپ رہے ہوتے ہیں اور ان میں سے پسینے کے بڑے بڑے قطرے باہر ٹپکتے ہیں۔ لوگ باڑ سے بچے ہوئے تربوز ریت میں سے نکلوا کر لاتے ہیں اور کسی جبر کے عالم میں خالی ہاتھوں ہی سے انہیں پھاڑ کر بڑے بڑے کھپڑ بناتے ہوئے اپنے منہ اس میں گاڑ دیتے ہیں۔ کچھ دور سے دیکھنے پہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ تربوز کہاں ختم ہوتا ہے اور ان کا منہ کہاں سے شروع؟ پہلے یوں لگتا ہے جیسے وہ تربوز کھا رہے ہیں، پھر تربوز انہیں کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ گودا، بیج، منہ، سب بے تحاشا بکھرے ہوئے نیچے بالوں میں دھنستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں میں صبر ہوتا ہے وہ تربوز کو ایسے ہی سر کے نیچے رکھ کر ٹھنڈی میٹھی ریت پہ لیٹ جاتے ہیں اور اپنے نفسانی ہاتھ اس کے گولائیوں پر پھیرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں کی

حدّت سے تربوز بھی جل اُٹھتا ہے، پھر وہ نہیں جانتے کہ اسے کھائیں یا پھینک دیں۔ کچھ جذباتی ناکتخدا ایسے ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر لیموں کو ملتے جاتے ہیں جو کہ لُو کا پورا حملہ خود پر لے کر پہلے تو لال ہو اُٹھتا ہے لیکن آخر میں کالا پڑ جاتا ہے۔

لُو سے بچنے کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہوتا ہے البتہ، ایک یہ بھی رسائین کہ آدمی چلتا ہوا خواہ مخواہ سردی محسوس کرنے لگے۔ اور اگر سوچ بچار کی اتنی رسائی نہ ہو تو لُو کے تیروں اور دانتوں کو کند اور بے اثر کرنے کے لیے ایسے ہی ہمک ہمک کر، اچھل اچھل کر گانے لگے!

لل لو، لل لو، لل لو، لل لو۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ پھر لُو کا کہیں نام و نشان نہیں رہتا، اور نہ انسان کا، کیونکہ جب تک لُو یوگ مایا ہو چکی ہوتی ہے اور بے چارہ انسان یوگی!

گور پر ساد کی باڑیں اور بیلیں سب جھلس چکی تھیں، کہیں نام کے لیے اوپر کوئی پتّا ہرا رہ گیا تھا۔ اس دبی ہوئی، نامحسوس مسکراہٹ کی طرح جو دل میں کسی شرارت سے اپنے آپ ہونٹوں پہ چلی آتی ہے۔ گری لال تو پھاٹک کے باہر ہی رُک گیا اور

کہنے لگا: ''نا بھیا، میں تو نہ جاتا، اندر۔''

''کیوں یار؟'' مکندی نے پوچھا ''کیا مصیبت ہے؟''

گری نے پھاٹک کی طرف اشارہ کیا جو یوں تو ہرے رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا، لیکن اس پہ سفیدے سے پتی ہوئی ایک تختی لگی تھی جس پہ کالے حرفوں میں لکھا تھا: کتے سے بچو!

مکندی گری لال کو کیسے بتاتا کہ کتا دراصل جانور نہیں ہوتا وہ صرف ایک احساس ہوتا ہے جو کثیف ہو کر چار ٹانگوں، ایک دم اور بڑے بڑے جبڑوں کو پھیلائے ہوئے بھونکتا چلا آتا ہے۔ ایسی بات نہیں، بیچ میں کہیں بدن بھی ہوتا ہے اس کا جسے وہ اپنے اندر کی وافر صحت سے اجنبی پہ یوں پھینک دیتا ہے جیسے غلیل مٹّی کے ڈھیلے کو۔ ایک پل کے لیے مکندی کو اپنا آپ جاہل، بے معنی اور بے وقوف لگا۔ اور کتا۔ لیکن آخر سمجھ چلی آئی جو کہ نزع میں بھی بے اختیار اور مجبور ہو کر چلی آتی ہے اور سونفیے کی زندہ خوشبو سے گڈ مڈ ہو جاتی ہے۔ سمبل کے نرم نرم، سفید سفید، گداز گداز پری کہانی کی طرح گولے پھاٹک کے آہنی کلیمپ میں پھنسے ہوئے تھے۔ مکندی نے ایک ہاتھ سے کلیمپ کو اُٹھایا اور دوسرے سے

پھاٹک کھولتے ہوئے کہنے لگا: "تم آؤ تو۔۔۔"

گری لال وہیں رُکا ایک ڈرے ہوئے بچے کی طرح انکار میں سر ہلاتا رہا۔

مکندی نے گری کے گرد ہاتھ ڈالا اور کہنے لگا: "کاٹے گا تو میرا ذمّہ، تمہارے کیا دانت نہیں ہیں!" اور پھر وہ ہنس دیا۔

گری لال کو اب تک یقین نہ تھا۔ پچھلی بار جب دت کے مونگرل نے اسے کاٹا تھا تو پورے چودہ ٹیکے لگوانے پڑے تھے۔ نہ صرف پیچھا سوج گیا تھا بلکہ ٹانگ میں بھی ایک طرح کا لنگ سا پیدا ہو گیا تھا، جو کسی علاج سے نہ جا رہا تھا اور جس کے کارن گری کی طبیعت ہمیشہ گری گری سی رہتی تھی۔ اس پہ طرفہ یہ کہ موتی دت کا مونگرل، اس کا دوست ہو گیا تھا۔ موتی کا رنگ کالا تھا، اس لیے صبح کے وقت جب گری لال ہوا خوری کے لیے نکلتا اور موتی اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیتا، تو ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ یدھشٹر ہے اور موتی وہ کالا کتا جو یدھشٹر کے ساتھ ہمالہ کی بلندیوں پہ چلا گیا تھا، جہاں وہ اور اس کا مالک دونوں برفوں میں گل کر مر گئے تھے۔ مکندی کے مجبور کرنے پہ گری بنگلے کے اندر چلا گیا، لیکن اس انداز میں کہ اگر ضرورت پڑے تو بھاگ بھی سکے۔ پھر وہ حیران بھی ہو رہا تھا کہ

مکندی اپنی لڑکی سے ملنے آیا ہے، تو ساتھ اسے کیوں لے آیا ہے؟ شاید مکندی کے اندر بھی کوئی کتا تھا جس سے وہ ڈر رہا تھا اور جس سے بچنے کے لیے اسے کسی بھی دوسرے آدمی کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ ہاں، انسان کو انسان کی ضرورت تو ہے ہی، ورنہ سب مردے اپنے آپ اُٹھ کر اپنی اپنی قبر میں لیٹیں۔۔۔ خود کو وافر لگنے کے باوجود ایک تحیر گری لال کو اندر لیے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی سرریلسٹ تصویر میں کے مرد کی آنکھوں کی طرح پپوٹوں سے دو دو انچ باہر نکلی ہوئی تھیں، اور ان پہ پیٹ بنا ہوا تھا۔ وہ سونفیا کو دیکھنا، نظروں سے اسے ٹوہنا اور اس کے ساتھ لپٹنا چاہتا تھا۔ سونفیا۔۔۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہرگز ہرگز خوبصورت نہیں ہے، لیکن اس قدر متناسب اعضا اور بھرپور صحت والی ہے کہ۔۔۔ (یہاں سے تحریر کا عجز شروع ہو جاتا ہے!)

جن لوگوں نے گورے رنگ پہ جان دی ہو، جانتے ہیں کہ اس میں آپ کچّے گوشت کے احساس سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن سونفیا کا سا کالا، نہ گورا رنگ ہمیشہ تندرستی کا نہ صرف لبالب بلکہ چھلکتا ہوا جام ہوتا ہے جو مرد کے گوگاں کو دور افتادہ جنوب مشرقی جزائر میں لے جاتا اور وہاں پوری زندگی گزارنے پہ مجبور کر

دیتاہے۔ سونفیا کے ملائم اور چکنے بدن کی تعریف گری لال نے کان پور میں سُنی تھی، جہاں کے چمڑا رنگنے والے اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ سب سے اچھی جلد کون سی ہوتی ہے۔ پھر لڑکی کو کنواری چاہنے کے باوجود قریبی سے قریبی دوست بھی خوبصورت عورت کے سلسلے میں اپنے آپ کو بدل کے طور پر رکھتے ہیں۔ وہ دیور کہلواتے اور بھابی کہتے ہیں اور جو بھی تھوڑی بہت لذّت ہاتھ آئے، لے کر چل دیتے ہیں، اور اب تو سونفیے کی خوشبو اور بھی تیز اور بوجھل ہو گئی تھی۔ بنگلے کا واحد سمبل ہوا اور لُو کے جھونکوں کے ساتھ اپنا رواں چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، خوشبو چھوٹے چھوٹے خواب بن کر چاروں طرف بکھر رہی ہے، یا وہ کوئی کنفیٹی ہے جو عشق کو خوش آمدید کہنے کے لیے اوپر کے کسی حکم سے مکندی پہ گرائی جا رہی ہے، لیکن پھر۔۔۔ لُو؟

عشق سے بڑی لُو اور کون سی ہوتی ہے؟ دونوں دوست، مکندی اور گری لال، اس راستے پہ چلنے لگے جو دو طرفہ ہو کر، بیچ کے سوکھے سڑے باغیچے اور خشک فوّارے کو لپیٹ میں لے کر، سامنے کے پورچ میں مل جاتا تھا اور جس پہ لال لال راجستھانی بجری پڑی جوتوں کے منہ میں کچر پچر کر رہی تھی۔ آخر وہی ہوا۔

مکندی اور گری کی بو پاتے ہی جبرو، سونفیا کے گریٹ ڈین، منھ پھاڑے ہوئے ان کی طرف لپکا۔ کتے کی آواز کتے ہی کی سی ہوتی ہے، لیکن جبرو کی کچھ شیر کی سی تھی۔ چونکہ کتے اور شیر میں کراس ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے جبرو آخر کار کتا ہی تھا۔ وہ دس برس اور بھی جیتا رہتا تو کتا ہی رہتا، پلّے ہی پیدا کرتا لیکن اس کے باوجود اسے یوں خونخوار طریقے سے لپکتے دیکھ کر مکندی اور گری لال وہیں تھم گئے۔ گری تو مکندی کے پیچھے چھپ گیا اور منھ میں استوتر پڑھنے لگا لیکن مکندی ویسے ہی نڈر کھڑا تھا، البتہ ہاتھ اس کے بھی صلح کی جھنڈی میں اُٹھے ہوئے تھے اور وہ پکار رہا تھا: جبرو، جبرو، جبرو۔۔۔

جو لوگ کتے کی نفسیات سے واقف ہیں، جانتے ہیں کہ آپ تھم جائیں تو کتا بھی تھم جاتا ہے اور مشکوک انداز سے دیکھتا ہوا کچھ دور کھڑا بھونکتا ہے۔ وہ کبھی تو ایک ٹک نو وارد کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی پیچھے کی طرف منہ کر کے مالکوں کو کچھ کہتا ہوا معلوم دیتا ہے۔ بیچ میں وہ اگلے پنجوں کے بل نیچا ہو ہو کے زمین کھدیڑتا، چھوٹی سی جست لیتا، آگے بڑھتا، پیچھے ہٹتا، سر کو چھوٹے بڑے جھٹکے دیتا ہوا مسلسل بھونکتا چلا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہہ رہا ہے: آ بیٹا، ماں کا دودھ پیا

ہے تو آمقابلے پہ۔ وہ شہ دیتا ہے اور مات کھاتا ہے، لیکن یہ سب برابر والے کی اینڈوکرین گلٹی پہ نر بھر ہے۔ اگر اس کی گلٹی جلدی جلدی اور تیز تیز ڈر کے لعاب کو خارج کرنے لگے تو کتا، جس کی سُونگھنے کی قوت بے پناہ ہوتی ہے، پہلے معاملے کی تہہ پہ پہنچ جاتا ہے اور آخر آدمی کہ تہہ پر۔

مکندی بالکل نہ ڈرا۔ اس نے ایک نظر اپنے اور پھر گری کے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ وہ کسی چپراسی، بھنگی یا بھک منگے کے تو نہ تھے جن سے کتوں کو خداواسطے کا بیر ہوتا ہے۔ کمینہ! خود چاہے سارادن کیچڑ اور گندگی میں کودتا پھاندتا پھرے، لیکن سامنے والے کو برابر صاف اور سُتھرا دیکھنا چاہتا ہے جو کہ بدمعاشی اور ناانصافی کی انتہا ہے۔ مکندی بدستور۔۔۔ جبرو، جبرو۔۔۔ پکارتا ہوا آگے بڑھا۔ جبرو نے کچھ رُک کر ایک غیر یقینی انداز سے بھونکا، پھر پاس آیا اور مکندی کو سونگھا، پیچھے کی طرف دیکھ کر بھونکا۔ یہی عمل اس نے گری کے پاس پہنچ کر دُہرایا۔ قریب ہی تھا کہ گری اُلٹے پاؤں بھاگ نکلے، لیکن مکندی نے مضبوطی کے ساتھ اسے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا اور بولا: ”سونگھ لینے دے، ایک بار اسے سونگھ لینے دے، گری۔“ ہو سکتا ہے گری کی پتلون کو سُونگھنے پہ جبرو کو کچھ

دھندلی دھندلی شکلیں نظر آئی ہوں۔ پھر اس نے منہ اُٹھا کر گری کی طرف دیکھا۔ کیا یہ وہی ہے؟ بیچ میں مکندی آ گیا۔ اب جبرو دُم ہلا رہا تھا اور اِدھر اُدھر پھر کر ایک عجیب طرح کی بے بس اور گڑل آوازیں نکال رہا تھا، جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ پھر وہ بھاگتا ہوا لکڑی کے کھمبے کے پاس پہنچ گیا جس کے اوپر رات کو روشنی کے لیے بتی لگی تھی۔ جب ہی اس نے ٹانگ اُٹھائی اور دنیا بھر کے کتوں کی طرح اپنے تناؤ کی تسکین کر لی۔

سامنے، برآمدے میں، سونفیا کی خادمہ جامن کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مکندی آگ بگولا ہو اُٹھا: ”باندھ کے کیوں نہیں رکھتیں اس باپ کو؟“

جامن ہریانے کے علاقے کی ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اس کا بدن گٹھا ہوا تھا اور رنگ سیاہی مائل۔ سونفیا نے اسے شاید اپنا رنگ، اپنا بدن آف سیٹ کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا اور مالش میں اپنی گرمی اس تک منتقل کرنے کے سلسلے میں اسے ٹھنڈائی سردائی وغیرہ پلاتی رہتی تھی۔ مکندی کی بات کے جواب میں جامن شرما دی۔ بھلا شرمانے کی کیا بات تھی اس میں؟ لیکن وہ بے چاری عمر کے اس حصّے میں تھی جس میں لڑکی کو کچھ بھی کہیں تو وہ شرما جاتی ہے۔ آپ اسے مونگ کی کہیں تو

وہ موٹھ کی سمجھ لیتی ہے اور پھر شرما جاتی ہے۔ آپ پوچھیں: ”تم شرمائیں کس بات سے؟“ تو اس کے جواب میں بھی وہ شرما جاتی ہے۔

جامن نے برآمدے میں بید کی دو کرسیاں مہمانوں کے لیے سرکا دیں اور خود مالکن کو اطلاع کرنے کے لیے اندر چلی گئی حالانکہ جبرو کے بھونکنے سے اسے ضرور پتہ چل گیا ہوگا کہ کوئی آیا ہے۔ لیکن کسی بھی لڑکی سے، خاص طور پر جب کہ وہ جوان ہو، یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ یوں دھڑ سے باہر چلی آئے گی۔ پہلے وہ اپنا آپ ٹھیک ٹھاک کرتی ہے، گڑیا کی آنکھ سے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتی ہوئی وہ اس پہ کے ایک ہی مہاسے کو پاؤڈر سے کوستی ہے اور پھر پاس پڑی کالی پنسل کو اُٹھا کر ٹھوڑی کے بائیں طرف، دیکھنے والے کی آنکھ کی پتلی کے برابر، ایک تل سا بناتی، اپنے قاعدے سے پٹے ہوئے بالوں میں سے چند ایک کو سرکش کرتی، آخری بار آئینے میں دیکھتی ہے کہ اس کے بدن، اس کے لباس میں رات کا تو کچھ نہیں؟ وہ یہ سب کرتی ہے، چاہے اسے اپنے ملاقاتی سے اس ناخن برابر بھی دل چسپی نہ ہو جسے وہ ابھی ابھی مینی کیور یا پالش کرتی آئی ہے۔

جب تک مکندی اور گری لال بیٹھ گئے، بالکل ہی۔ جب ہی گری نے مکندی سے

پوچھا: ”جبرو نے شروع میں بھی کبھی تمہیں کاٹنے کی کوشش نہیں کی؟“

”نہیں۔“ مکندی نے جواب دیا۔

”کیوں؟ کتّے تو۔۔۔“

”بات یہ ہے کہ جب آدمی نے خود کتّا رکھا ہو، اسے دوسرے کا کتّا کبھی نہیں کاٹتا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب، اپنے کتّے کی بُو اس میں رس بس جاتی ہے نا، جس کا ہمیں تمہیں پتہ نہیں چلتا لیکن کتّے کو ہمیشہ چل جاتا ہے۔ پھر وہ دُم ہلانے، چاٹنے لگتا ہے۔ کتّا ہمیشہ اسے پیار کرتا ہے جس کے پاس کتا ہو۔“

”ہاں، تمہارا وہ براؤں ڈاشنڈر کی۔۔۔ بڑا پیارا کتّا ہے!“

جبھی سونفیا اپنے لانبے بالوں کا جوڑا بناتی، دونوں ہاتھوں سے اسے دباتی ہوئی باہر آئی۔ وہ یہ کام اندر بھی کر سکتی تھی لیکن شاید وہ یہیں باہر ہی اچھا تھا۔ دونوں بازوؤں کے اُٹھنے سے سونفیا کا اصل دکھائی دیتا تھا۔ گری لال اور مکندی تعظیماً

اُٹھ کھڑے ہوئے اور نمستے کی۔

گری لال کا تعارف کراتے ہوئے مکندی نے کہا: گری لال، میرے دوست ہیں، کانپور میں ایل آئی سی میں کام کرتے ہیں۔"

سونفیا نے سر ہلا دیا اور جان بوجھ کر اپنی آنکھوں میں سے غائب ہو گئی، جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتی تھی اور جس سے اس کے کئی گملٹ پیے ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "بیٹھیے۔"

سونفیا بیس بائیس برس کی ایک کھلے ہاتھ پیر والی لڑکی تھی۔۔۔ مطمئن بالذّات۔ اس کے اس اطمینان میں فن کتنا تھا اور نیچر کتنی، اس کا اندازہ آسانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ اس میں کی آگ کا صرف اتنا ہی پتہ چلتا تھا جتنا کہ بجلی کے تار کو دیکھنے۔۔۔ صرف دیکھنے سے اس میں کی قوّت اور جوش کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش موٹے موٹے اور بھرے پُرے تھے۔ وہ اپنی عام حرکت میں بھنگڑہ ناچنے والوں کی طرح سے قوّت کو اندر کھینچنے کی بجائے باہر پھینکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، یا شاید ویسے ہی اس کی صحت عام ہندوستانی لڑکیوں سے اچھی تھی۔ جامن۔۔۔ جو دیہاتی خوبصورتی کا اچھا نمونہ تھی۔۔۔ اس کے سامنے یوں

ہی معلوم ہوتی تھی جیسے آم کے سامنے جامن۔ وہ گوری تھی یا گندمی یا کچھ اور بھی، اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ دھوپ میں ہوتی تو تانبا ہو جاتی، سائے میں ہوتی تو سفید، دریا کے کنارے سانولی اور اپر انڈیا کلب میں سلونی۔ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود وہ روز صبح مندر ضرور جاتی تھی، شاید اس لیے نہیں کہ اس میں اس کی آتما کو شانتی ملتی تھی، بلکہ اس لیے کہ مندر جانے والا آدمی وقت پہ سوتا اور وقت ہی پہ جاگتا ہے جس سے بدن کی رطوبتیں خشک نہیں ہوتیں اور وہ ہرا بھرا اور شاداب رہتا ہے، اندر کا فریجیڈیئر جو جسم کے اعضا کو یکجا اور تر و تازہ رکھتا ہے اچھی طرح کام کرتا ہے۔ اسی لیے جب مندر سے سفید ساری میں ملبوس سونفیا باہر آتی تو دیوی لگتی اور کلب میں جاتی تو صوفیا لارین۔ اس کی آواز میں سے کئی ریزے، کئی دانے غائب تھے۔ شاید وہ اپنے ارادے سے انہیں غائب کر دیتی تھی۔ بہر حال، اس کی آواز میں ایک انگیخت پیدا کرنے والا کھرکھرا پن، ایک اٹوٹ رکھب سا رہتا تھا جو کبھی مدھم پہ نہ پہنچتا، جیسے وہ بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھوں سے مفرور ہو جاتی تھی، ایسے ہی گلے سے بھی۔

جامن نے ایک اور بید کی کرسی سرکا دی لیکن سونفیا نے بیٹھنے کی کوشش ہی نہ

کی۔ یوں ہی کھڑے کھڑے وہ مغایرت کے انداز میں بولی۔ ”کہیے؟“

مکندی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ مطلب یوں تھوڑے کہتے ہیں؟

پھر سونفیا نے بازو اُٹھا کر اپنے جوڑے میں ایک سوئی کو دبایا اور انگریزی میں روکھے پھیکے انداز سے کہا۔ ”میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

مکندی کے اوسان اور بھی خطا ہو گئے۔ گری ساتھ نہ ہوتا تو وہ اُسے جوتا بھی مار دیتی تو کوئی پروا نہ تھی، لیکن اس وقت۔۔۔ مکندی کو غصّہ آیا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ قدرت میں کتنی بے رحمی تھی جو مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے بے نیاز نہ ہونے دیتی تھی۔ کاش وہ اپنے آپ میں مکمل ہوتے۔ سونفیا نے ہمیشہ اس سے ایسی ہی بے رُخی برتی تھی۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی! وہ تعلیم یافتہ تھا۔ لکھنؤ سے ایل ایل ڈی کر چکا تھا۔ پھر وہ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ پچھلے ہی سال وہ صحت کے مقابلے میں مسٹر لکھنؤ قرار دیا گیا تھا۔ مکندی نے اپنے آپ کو روکا۔ اندر کے جبر و کو تہذیب و اخلاق کی ایک موٹی سی زنجیر کے ساتھ باندھ دیا ورنہ اگر کوئی لڑکا بڑھ کر کسی لڑکی سے کہہ دے ”آپ میرے لیے کر ہی کیا سکتی ہیں؟“ تو پھر لڑکی کے پاس کیا رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ

اس کا رنگ پیلا پڑ جائے اور منہ پر کف لاتے ہوئے وہ اپنے بازو کی سویپ کے ساتھ باہر کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہے۔ ”چلے جایئے، نکل جایئے میرے یہاں سے۔“ مصلحت۔۔۔ مکندی نے کہا تو صرف یہ۔ ”اس دن۔۔۔ آج میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا لیلا دیوی ہی کو سلام کرتے چلیں۔ اس دن اپر انڈیا کلب کے فینسی ڈریس میں تو آپ نے کمال ہی کر دیا! بالکل مریہ گونڈلڑ کی معلوم ہوتی تھیں۔“ اور پھر دل میں کہا ایک موتیاری جسے سر پہ چٹائی رکھے ہوئے اس کا چیلک سرِ شام ہاتھ سے پکڑ کر گھوٹل میں لے آتا ہے۔ رات بھر وہ کنوارے ایک دوسرے سے لپٹتے پیار کرتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی بیلوسا انہیں باہر دھکیل دیتی ہے، سورج کی روشنی سے پہلے کیونکہ وہ رات کی شرارتوں کو یاد کرتے ہوئے بہت زیادہ ہنستے اور کھکھلاتے ہیں۔

سونفیا نے کہا بھی تو صرف اتنا۔ ”شکریہ!“

وہ ٹھنڈی تھی؟ برف کا تودہ؟ پتھر میں بھی تیل ہوتا ہے۔ شاید کسی بو کسی لمس نے اس کے اندر کی آگ کو نہیں بھڑکایا تھا۔ اتنی لُو میں بھی وہ پگھل اور پسیج نہ رہی تھی۔ مکندی نے کچھ اور باتیں کرنے کی کوشش کی۔ ایسی باتیں جن کا

جواب لمبا ہو، لیکن سونفیا جانے اختصار کی روح کو پا گئی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا جواب دیتی، بلکہ ٹکا سا۔ مکندی نے اسے وہ سماں یاد دلایا جب وہ سفید ساری میں ملبوس نروتم کے مندر سے نکلی تھی اور صبح کے دُھندلکے کی طرح سے حسین معلوم ہو رہی تھی اور شانت۔ مندر کی سیڑھیوں پر کوئی سور داس اکتارے پر بلمپت لَے میں بھیرویں کے سُر اَلاپ رہا تھا۔ اور دل میں کہا۔ "جب تم سے لپٹنے، تمہیں پکڑنے کے بجائے تمہارے قدموں پہ لوٹنے کو جی چاہتا ہے۔"

مندر سے لوٹنے والی یوتی سے بات مت کرو کیوں کہ وہ آفاقی ہو چکی ہے۔ اس وقت کا انتظار کرو جب ایک بار پھر اس میں مقامیت لوٹ آئے۔۔۔

لیکن کیسے؟ سونفیا تو جیسے مندر سے نکلتی ہی نہ تھی، مقامیت کو لوٹتی ہی نہ تھی۔ کسی کو سامنے پاتے ہی وہ کہیں دور پہنچ جاتی۔ دریا کے کنارے اس کی سہیلیوں کا جمگھٹ اس کے ارد گرد رہتا تھا اور کلب میں منچلوں کا۔ اور وہ کسی کی پکڑ میں نہ آتی تھی۔ وہ اَنیک سے ایک ہوتی تو بات بنتی۔ وہ اپنے بدن کو صحت سے بھرتی جا رہی تھی جو کہ اب تک قارون کا خزانہ ہو چکی تھی۔ وہ اس سیدھی سادی حقیقت کو نہ جانتی تھی کہ عورت نام ہے خرچ ہونے کا، گھٹنے اور بڑھنے کا، مناسب وقت

کے بعد خاک اور خون میں لت پت ہونے کا۔۔۔ ورنہ وہ عورت نہیں رہتی، لیونارڈو کا شاہکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

یا شاید مکندی اناڑی تھا اور نہیں جانتا تھا کہ لڑکی سے بات کیسے کی جاتی ہے؟ بات کر بھی لی جائے تو آگے کیسے بڑھائی جاتی ہے؟ شرافت سے بات بنتی ہے یا غنڈہ گردی سے؟ اسے صحیح تو ایک طرف، غلط سلط طریقے سے بھی لڑکی کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ غالباً وہ ان مردوں میں تھا جو کسی طرح سے اپنے چال چلن کو خراب نہیں ہونے دیتے اور سمجھتے ہیں، یہ بات عورت کو بہت متاثر کرتی ہے۔

جانے سونفیا اس سے اس لیے بات نہیں کرتی کہ وہ خوبصورت تھا اور مسٹر لکھنؤ۔ ایسے آدمی کے بارے میں لڑکی کو یقین نہیں آتا۔ یا پھر اس میں ایسا کوئی جذبہ ہے جس سے وہ بدصورت اور جنگلی قسم کے آدمی کو ترجیح دیتی ہے۔ کیا اس لیے کہ حسن اور خوبصورتی، نرمی اور گداز پن اور مظلومیت اسی کا اجارہ ہیں اور بدصورتی اور کرختگی اور بربریت مرد کا؟

مکندی نے سوچ لیا کہ اب اس کی دوڑ دھوپ سے کوئی کام نہیں بنتا۔ گور پرساد ہی کچھ ہو تو ہو۔ بنگلے سے نکلتے وقت جبرو نے منہ اٹھا کر بھی تو نہ دیکھا: کہاں وہ شور

وشغب کے زلزلے لے آیا تھا۔ پھاٹک کی طرف بڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سمبل نے اپنی پری کہانیاں روک کر ان کے گھٹیا جاسوسی قصّے بنا دیے تھے اور انھیں ریلوے کے بُک اسٹالوں پہ بیچنا شروع کر دیا تھا۔ ڈھلتی ہوئی شام میں وہ گالے Nuns کی طرح سے سفید اور پاکیزہ خیالات کی بجائے کالے بھجنگ، گندے اور فحش دلال ہو گئے تھے۔ آم گلنے، سڑنے لگے تھے اور انسان کے کام و دہن نے ذائقے سے منہ موڑتے ہوئے انھیں پیڑ ہی پہ متعفّن ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا، اور جامن کو اس بات کے لیے مجبور کر دیا تھا کہ وہ جبر و سے مجامعت کرے اور بار بار کرے۔

اسی شام اپر انڈیا کلب میں بڑی رونق تھی۔ بمبئ سے ارشاد پنجتن (Mime) نقال چلا آیا تھا، جس نے حال ہی میں مغرب کا نہایت کامیاب دورہ کیا تھا۔ ہر دارالخلافے میں اس کی کمانڈ پرفارمنس ہوئی تھی جو تیقن کی چمک اس کی آنکھوں میں اور خوش حالی کی سُرخی گالوں پہ لے آئی تھی۔ اس نے لوگوں کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ صرف مکندی ان سب سے کٹا ایک طرف بیٹھا گملٹ میں اپنی کچھ دیر پہلے کی ہزیمت کو ڈبو رہا تھا۔ گری لال جان بوجھ کر

سٹک گیا تھا۔ ہاں، ہارے ہوئے آدمی کے ساتھ ہمدردی کرو تو بُرا، نہ کرو تو بُرا۔ اور اس ہاں اور نہ کے بیچ کا فن نہایت گھٹیا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ نہ معلوم سونفیا کے سلسلے میں مکندی نے اس کے سامنے کیا کچھ ڈینگیں ماری تھیں، جو۔۔۔

برج اور شطرنج کھیلنے والے بھی اپنے اپنے کھیل چھوڑ کر تھیٹر کارنر میں ارشاد پنجتن کی نقالی دیکھنے چلے گئے تھے۔ بیرے بے کاری کے عالم میں وہسکی، شیری یا رَم کی بوتل کے ساتھ خالی گلاس اور سوڈا ٹرے پہ رکھے اور چابی ہاتھ میں لیے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ آرکسٹرا کا گوانی لیڈر اپنے ریگولیشن سوٹ میں کوئی اذیت سی محسوس کر رہا تھا۔ دن کے مقابلے میں اس وقت گرمی کم تھی کیوں کہ لُو چلنا بند ہو گئی تھی، لیکن اس پہ بھی شرابی کے اُلٹے سانس کی طرح سے بیچ بیچ میں گرم اور متعفّن ہوا کا جھونکا چلا آتا تھا کیوں کہ کلب کے نیچے ہی شہر کا گندا نالہ تھا جس کا پانی کوئی سو ڈیڑھ سو گز پرے دریا میں گرتا تھا۔ وہ بار بار اپنا سفید رومال نکال کر اپنا منہ اور اپنی گردن پونچھتا تھا اور پھر نہ جانے کیوں اس رومال کو دیکھتا تھا جس پہ مٹی اور پسینے کی میل چلی آئی تھی۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس کا کالا رنگ جانے لگا ہے اور کچھ دنوں میں وہ گورا ہو جائے گا۔ پھر وہ جھلّا کر ڈبل بیس پہ

اپنا ہاتھ مار دیتا تھا جس سے عجیب طرح کی بیزار کر دینے والی آواز نکلتی تھی۔ اکیلا ساز اور وہ بھی بے وقت بے ہنگم طریقے سے بجے تو ایک اینٹی میوزک کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جتنا میوزک سے لطف آتا ہے، اتنی ہی اینٹی میوزک سے بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ آخر سارا سلسلہ ساز و آہنگ ہی کا ہے نا!

شیلو گورنر کے اے ڈی سی کی لڑکی تھی اس لیے وہ اپنے آپ کو گورنر ہی سمجھتی تھی۔ اور یہ تھا بھی ٹھیک کیونکہ بُڈّھا گورنر جب بھی دورے پہ جاتا تھا شیلو کو اپنے خاص سیلون میں ساتھ لے جاتا تھا اور کسی کو پتہ نہ چلتا تھا کہ کسی گھاتک کو پھانسی کی سزا سے عمر قید میں بدل جانے یا بالکل ہی چھوٹ جانے میں شیلو کا کتنا ہاتھ تھا۔ شیلو کی عمر کوئی تیس ایک برس کی تھی مگر وہ کنواری تھی۔ شادی کے سلسلے میں اس کی عمر ممکن شوہروں کو آزمانے ہی میں گزر گئی تھی۔ لڑکیوں کے لیے اکثر ان کے بڑے باپ کی بیٹی ہونا زیادہ خوبصورت اور پڑھی لکھی ہونا ان کی شادی کے منافی ہوتا ہے۔ شیلو یوں کوئی ایسی فلرٹ نہ تھی لیکن اس وقت ساز اور آہنگ کے کھیل میں وہ اس کم بخت مائیم کے آجانے سے صرف ساز ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے سدھانت شہر کے چیمبر آف کامرس کے پریذیڈنٹ کے

ساتھ وہ والٹس ناچتی رہی تھی، لیکن مائیم کے منظر پہ آتے ہی سدھانت نے شیلو کو یوں چھوڑ دیا جیسے انگریز لوگ ہاتھ سے گرم گرم آلو چھوڑ دیتے ہیں اور والٹس کا آہنگ شیلو کے بدن میں تھم کر رہ گیا تھا۔ کسی لڑکی میں آہنگ شروع ہی نہ ہو تو وہ برسوں کسی تان پُرے کی طرح سے گھر میں ایک کھونٹی پہ لٹکی ہوئی رہ سکتی ہے لیکن اگر وہ شروع ہو جائے یا اسے کوئی چھیڑ دے تو پھر وہ دُھن یا ڈانس نمبر کو تکمیل تک پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ اور والٹس کا آہنگ شیلو کے تقریباً کنوارے بدن میں تھم کر رہ گیا تھا جسے وہ کہیں بھی کیسے بھی جھٹک دینا چاہتی تھی۔

اور سامنے مکندی بیٹھا تھا۔۔۔ خوبصورت اور مسٹر لکھنؤ!

اور اکیلا!

جانے اکائی عورت کو کیوں ہمیشہ پریشان کرتی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ دوئی کی نمائندہ ہے اور اسے بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ہندسوں میں دو، تین، چار۔۔۔ ان سے زیادہ کی دلیل ہے اس لیے جب کہیں کوئی رشتے کی بات چلتی ہے تو اس کا استمرار دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے اور وہ فوراً حرکت میں آجاتی ہے۔

وہ۔۔۔ جمع اور ضرب کی قائل۔۔۔ خیر، یہ حساب کی باتیں ہیں۔ شیلو دونوں ہاتھ اُٹھا کر ان سے اپنے سر کے بالوں کو کچھ اور ڈھیلا اور بے ربط کرتی ہوئی مکندی کے پاس چلی آئی۔

"آپ۔۔۔ آپ نہیں دیکھنا چاہتے پینٹومائیم؟"

"نہیں۔" مکندی نے سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"مجھے نقل اچھی نہیں لگتی۔"

"اصل اچھی لگتی ہے؟" شیلو نے معنی خیز انداز سے کہا اور پھر اپنے آپ ایک کرسی سرکاتی ہوئی مکندی کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ "مجھے بھی یہ نقل پسند نہیں، زندگی کی نقل۔" وہ خفیف سا ہانپ بھی رہی تھی، جیسے حالات پہ کچھ غصّہ تھا۔ اس نے بیرے کو آواز دی جو پہلے ہی کہیں بھی کوئی بھی کام چاہتا تھا۔ وہ بھاگا ہوا آیا، دست بستہ۔ ابھی اس نے مایوس ہو کر ٹرے بار کے کاؤنٹر پہ جا رکھی تھی۔ شیلو نے آرڈر دیا۔ "ایک شیری، ڈبل!"

نہ چاہتے ہوئے بھی مکندی نے بیرے سے کہا۔ "میرے حساب میں۔"

"نہیں نہیں۔" شیلو نے احتجاج کیا اور پھر مکندی کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر بیرے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "اوکے، مورس!"

اور بیرا "یس میڈم" کہہ کر بار کی طرف چل دیا۔ تیز تیز۔

ارشاد پنجتن ایک دندان ساز کی نقل اُتار رہا تھا۔ پہلے اس نے دور سے مریض۔۔۔ فرضی مریض۔۔۔ کو آتے دیکھا اور خوش ہوا کہ گاہک پھنسا۔ اس کے آنے سے پہلے اس نے کرسی ورسی ٹھیک کی ہاتھوں سے ہی گرد کو جھاڑا اور جیسے ہی مریض آیا اس نے مؤدب طریقے سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر ایسے ہی منہ ہلا ہلا کر اس کی دردناک باتیں سنتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ بے چارہ درد کی شدّت سے رات بھر نہیں سویا لیکن دندان ساز بے نیازی سے اس کی داستان سنتا رہا۔ پھر اس نے اشارہ کیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور اسے ڈینٹسٹ کی کرسی پہ بیٹھنے کے لیے کہا جس کے بعد اس نے مریض کو منہ کھولنے کی ہدایت دی۔ مائیم چونکہ دندان ساز بھی خود تھا اور مریض بھی خود ہی، اپنا منہ کچھ اس طریقے سے کھولا کہ وہ زمانہ یاد آگیا جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا۔ دندان ساز نے غار کی

قسم کے اس منہ میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے فرضی بتّی کو کھینچ کر مریض کے برابر کیا اور روشنی میں اندر جھانکا۔ کیا ہو کا سا اندھیرا ہو گا کہ ڈاکٹر کو منہ میں انگلی ڈال کر مسوڑھوں اور دانتوں کو ٹوہنا پڑا۔ جب ہی وہ فرضی مریض ایک دم ٹیس سے بلبلاتا دکھائی دیا۔ غالباً دندان ساز کا ہاتھ اندر ہلتے جھولتے ہوئے دانت اور اس کے پاس کی کسی ننگی رگ کو جا لگا تھا۔ ہاتھ نکالتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے تسلّی دی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب جب کہ وہ شہر کے سب سے بڑے اور سب سے قابل دندان ساز کے پاس آ گیا ہے اسے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ پھر اس نے آنکھوں میں دہشت سمو کر دو تین بار کی مدد سے بتایا کہ اندر بہت بڑی Cavity ہے جس میں سے اکبر کے زمانے کا پورا لشکر مع ہاتھی ہودے اور گھوڑے وغیرہ کے گزر سکتا ہے۔۔۔ لیکن چنتا کی کوئی بات ہی نہیں!

پھر اس نے مشین کے اوپر ایک فرضی بوتل سے روئی کے پھوئے نکالے اور ایک کے بعد دوسرا منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے دانت اور اس کے نواح کو آلائشوں سے پاک کیا۔ پھر دیکھا۔۔۔ بتّی کو اور نزدیک کرتے ہوئے۔۔۔ اور سر ہلایا کہ دانت نکالے بغیر گزارہ نہیں اور چپکے سے اوزاروں کی پلیٹ میں سے

زنبور اُٹھایا جسے دیکھتے ہی مریض کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ ڈینٹسٹ کو پھر اسے تسلّی دینا پڑی۔ پچکاری سے دانت اور اس کے نواح کے علاقے کو بے حس اور مردہ کرنا پڑا۔ آخر جب دانت اس کے ارد گرد کا حصّہ حتیٰ کہ مریض بھی مردہ ہو گئے تو اس نے زنبور اندر ڈال کر مضبوطی سے دانت کو پکڑا اور ایک دو جھٹکوں ہی سے اسے باہر نکال دیا۔ اس کے جھٹکوں کے ساتھ مریض اُچھلتا بلبلاتا تھا، لیکن اب وہ ایک طرف ڈاکٹر اور دوسری طرف زنبور کی پکڑ میں تھا! وہ کر کیا سکتا تھا۔ تڑپ کر رہ گیا بے چارہ۔ ڈاکٹر بہت خوش تھا۔ اس نے دانت کو آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر سے کوئی پرچھائیں سی گزری۔ جب ہی مریض کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈالا تو اسے پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے صحیح و سالم دانت کو نکال دیا تھا۔ ٹوٹا ہوا اور کرم خوردہ دانت ابھی وہیں تھا، جوں کا توں!

اب مریض اور ڈاکٹر دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اسی مشین اسی فرضی کرسی کے ارد گرد اور لوگ بے تحاشا ہنس رہے تھے تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ مایئم اس قدر کمینہ تھا کہ مریض اور ڈاکٹر دونوں کی چال اور دونوں کی دوڑ کا ایک دم الگ الگ اور بے حد کامیاب نقشہ کھینچ رہا تھا۔

بیچ میں کہیں سونفیا بھی آ گئی۔ ظاہر ہے کہ تھیٹر کارنر میں جانے سے پہلے وہ کلب ہال ہی سے گزر کر آئی ہو گی۔ آج اس نے معمول سے زیادہ دل کش میک اَپ کر رکھا تھا، اس پہ بھی وہ کچھ ایسی کھلی ہوئی نہ تھی جیسی کہ وہ عام طور پر ہوتی تھی۔ کیا وہ آج صبح مندر نہیں گئی تھی؟

مائیم نے اپنے پروگرام کی دوسری مد شروع کی جو کہ ایک فرسٹریٹڈ یعنی کہ محروم و مہجور عاشق کے بارے میں تھی۔ سب سے پہلے سدھانت سونفیا کو دیکھ کر مجمعے سے باہر چلا آیا، پھر رشید علی، کلب کا منیجر۔ آرکسٹرا کے لوگ چوکنّے ہو گئے اور گوانی لیڈر اپنی ٹائی کی ناٹ کو کستا ہوا ڈبل بیس کے پیچھے آ بیٹھا۔ بیرا لوگ بھی مستعد ہو گئے۔ پھر ابھینکر نے اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مجمعے میں سے کھینچ لایا اور کشاں کشاں بساط پر لے آیا، بظاہر اگلی چال کے لیے۔ بے چارے مائیم کے کھیل کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دوسروں کا کھیل دیکھ رہا تھا!

سدھانت اور کچھ دوسرے لوگوں نے دیکھا مکندی اور شیلو وہاں سے غائب تھے۔ مرمر کے میز کی ٹاپ پہ دو گلاس خالی پڑے تھے۔ ایش ٹرے میں بہت سی

سگریٹوں کے بچے ہوئے ٹکڑے اور ایک طرف دستخط کیا ہوا بِل جس پہ پانچ کا ٹپ پڑا تھا اور جو صدر دروازے سے آنے والی ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا!

کچھ دن بیت گئے۔ مکندی اور گری لال آپس میں ملے اور اور ایک دوسرے کی کمر میں ٹھوکے دے دے کر ہنستے ہنساتے رہے۔

چند لوگوں کو صرف سنیچر کی شام کو چھٹی کا احساس ہوتا ہے کیوں کہ اگلے روز کہیں آنا جانا تو ہوتا نہیں، مزے سے آدمی بستر پر پڑا منہ میں پرانی یادوں کی خوبانیاں پپول سکتا ہے اور اس کے ذائقے سے قندِ مکرّر کا لطف اُٹھا سکتا ہے۔۔۔ جو قند سے بھی زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

سنیچر کی شام کو جب گری لال مکندی کے ہاں شری نواس میں آیا تو دیکھا مکندی کا چہرہ کانوں کی لووں تک لال ہو رہا ہے۔ وہ خوش بھی تھا اور نہیں بھی۔ گری لال نے اس کی وجہ پوچھی تو دیکھا کہ جواب دینے میں مکندی بھی ایکا ایکی اپنی نظروں سے کہیں غائب ہو گیا ہے اور ہر بات کا جواب ”ایں؟“ سے شروع کرتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر پوچھنے والے کو خواہ مخواہ اپنی بات دُہرانی پڑتی ہے۔

بیزار ہو کر گری لال نے مکندی کو دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور زور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”مکندی، بات کیا ہے آخر؟“

”کچھ نہیں“ پہلے تو مکندی نے کہا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی کرسی گری لال کے پاس سرکائی اور بولا۔ ”سن یار، ایک عجیب سی بات ہوئی۔“ اور پھر وہ رُک گیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اب بھی بتائے یا نہ بتائے۔

”بڑا کمینہ ہے، یار تو۔“ گری نے کہا۔ ”ایسی بھی کیا بات ہے جو تو گری سے چھپائے گا؟“

”بتاتا ہوں۔“ مکندی راز داری کے انداز میں اپنا منہ گری لال کے کانوں کے پاس کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ سونفیا۔۔۔“

”ہاں ہاں، سونفیا؟!“

”ہم جتنا اسے برف کا تودہ سمجھ رہے تھے، اتنی ہی وہ آگ نکلی۔“

”سچ؟“ اور گری لال کا چہرہ بھی تمتمانے لگا اور پھر اس نے حیران ہو کر کہا۔ ”کہاں، کیسے ہوا یہ سب؟ اسے کیا شیلو اور تمہارے بارے میں پتہ چل گیا تھا؟“

”نہیں۔“مکندی نے جواب دیا۔”ہم تو اس کے کلب میں آنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل کر دریا کے کنارے چلے گئے تھے۔“

”پھر؟“

”پھر۔“مکندی نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سونفیا کے رام ہو جانے کی کوئی بڑی لمبی چوڑی وجہ بیان کرنے جا رہا ہے لیکن جبھی سامنے، بر آمدے کی طرف اس کا ڈاشنڈ، رکی، کوئی اجنبی بو پاتا، بھونکتا ہوا اچلا آیا۔

”رکی۔۔۔رکی۔“مکندی نے پکارا لیکن وہ گری کے پاس پہنچ کر اسے سونگھ چکا تھا۔ پھر مکندی کے پاس آتے ہوئے اس نے اسے سونگھا، سر اُٹھا کر اس کے منہ کی طرف دیکھا اور دُم ہلا ہلا کر وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں چاٹنے لگا۔ مکندی نے مسکراتے ہوئے گری لال کی طرف دیکھا اور پھر رکی کو اُٹھا کر اس کے بدن پہ ہاتھ پھیرنے، اس سے پیار کرنے لگا۔

وہ بُڈّھا

میں نہیں جانتی۔ میں جارہی تھی مزے سے۔ میرے ہاتھ میں ایک کالے رنگ کا پرس تھا، جس میں کچھ چاندی کے تار کڑھے ہوئے تھے اور میں ہاتھ میں اسے گھمارہی تھی۔ کچھ دیر میں میں اُچک کر فٹ پاتھ پہ ہو گئی، کیونکہ مین روڈ پر سے اِدھر آنے والی بسیں ایک دم راستہ کاٹتی تھیں۔ اڈّے پر پہنچنے اور ٹائم کیپر کو ٹائم دینے کے لیے۔ جبھی اس موڑ پر ہمیشہ ایکسیڈنٹ ہوتے تھے۔

بس تو خیر نہیں آئی، اس پر بھی ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میری دائیں طرف سامنے کے

فٹ پاتھ کے اُدھر مکان تھے اور میرے اُلٹے ہاتھ پر اسکول کی سیمنٹ سے بنی ہوئی دیوار، جس کے اُس پار مشنری اسکول کے فادر لوگ ایسٹر کے سلسلے میں کچھ سجا بنا رہے تھے۔ میں اپنے آپ سے بے خبر تھی، لیکن ایکا ایکی جانے مجھے کیوں محسوس ہونے لگا کہ میں ایک لڑکی ہوں۔۔۔ جوان لڑکی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ میں نہیں جانتی، مگر ایک بات کا مجھے پتہ ہے کہ ہم لڑکیاں صرف آنکھوں سے نہیں دیکھتیں۔ جانے پرماتما نے ہمارا بدن کیسے بنایا ہے کہ اس میں کا ہر پور دیکھتا، محسوس کرتا، پھیلتا اور سمٹتا ہے۔ گدگدی کرنے والا ہاتھ لگتا بھی نہیں کہ پورا شریر ہنسنے مچلنے لگتا ہے۔ کوئی چوری چپکے دیکھے بھی تو یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں سوئیاں ایک ساتھ چبھنے لگیں، جن سے تکلیف ہوتی ہے اور مزا بھی آتا ہے۔ البتّہ کوئی سامنے بے شرمی سے دیکھے تو دوسری بات ہے۔

اُس دن کوئی میرے پیچھے آ رہا تھا، جسے میں نے دیکھا تو نہیں پر ایک سنسناہٹ سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ جہاں میں چل رہی تھی، وہاں برابر میں ایک پرانی شیورلے گاڑ رُکی، جس میں ادھیڑ عمر کا بلکہ بوڑھا مرد بیٹھا تھا۔ وہ بہت معتبر اور رُعب داب والا آدمی تھا۔ عمر نے جس کے چہرے پر لوڈو کھیلی تھی، اس کی ایک

آنکھ تھوڑی دبی ہوئی تھی جیسے کبھی اسے لقوہ ہوا ہو، لیکن وٹامن سی اور بی کمپلیکس کے ٹیکے وغیرہ لگوانے، شیر کی چربی سے مالش کرنے یا کبوتر کا خون ملنے سے ٹھیک ہو گیا ہو۔ لیکن پورا نہیں۔ ایسے لوگوں پہ بڑا ترس آتا ہے کیونکہ وہ نہیں مارتے، اس پر بھی پکڑے جاتے ہیں۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تو پہلے میں بھی اسے غلط سمجھ گئی، لیکن چونکہ میرے اپنے گھر میں چچا گووند اس بیماری کے مریض ہیں، اس لیے میں جان گئی اور دیر تک مجھے کچھ وہ نہ رہا۔ میں اپنے آپ میں شرمندہ سی محسوس کرنے لگی۔ اس بُڈھے کے داڑھی تھی جس میں روپے کے برابر ایک سپاٹ سی جگہ تھی۔ ضرور کسی زمانے میں اس کے وہاں کوئی بڑا سا پھوڑا نکلا ہو گا، جو ٹھیک تو ہو گیا لیکن بالوں کو جڑ سے ہی غائب کر گیا۔ اس کی ڈاڑھی سر کے بالوں سے زیادہ سفید تھی۔ سر کے بال کھچڑی تھے۔۔۔ سفید زیادہ اور کالے کم، جیسے کسی نے مونگ کی دال تھوڑی اور چاول زیادہ ڈال دیے ہوں۔ اس کا بدن بھاری تھا، جیسے کہ اس عمر میں سب کا ہو جاتا ہے۔ میرا بھی ہو گا۔ کیا میٹرن لگوں گی۔ لوگ کہتے ہیں تمہاری ماں موٹی ہے، تم بھی آگے چل کر موٹی ہو جاؤ گی۔ عجیب بات ہے نا کہ کوئی عمر کے ساتھ آپ ہی اپنی ماں ہو

جائے یا باپ۔ بُڈھے کے قد کا پتہ نہ چلا البتہ، کیونکہ وہ موٹر میں ڈھیر تھا۔ رُکتے ہی اُس نے کہا۔۔۔ ’’سُنو۔‘‘

میں رُک گئی، تھوڑا جھک بھی گئی، اُس کی بات سننے کے لیے۔۔۔

’’میں نے تمھیں دور سے دیکھا‘‘ وہ بولا۔

میں نے جواب دیا۔ ’’جی؟‘‘

’’میں جو تم سے کہنے جا رہا ہوں، اس پہ خفا نہ ہونا۔‘‘

’’کہیے‘‘ میں نے سیدھی کھڑی ہو کر کہا۔

اس بُڈھے نے پھر مجھے ایک نظر دیکھا، لیکن مجھے زیادہ کچھ وہ نہ ہوا۔ کیوں کہ وہ بڈھا تھا۔ پھر اس کے چہرے سے کوئی ایسی ویسی بات نہ معلوم ہو رہی تھی، نہیں لوگ کہتے ہیں بُڈھے بڑے لاگی ہوتے ہیں۔

’’تم جا رہی تھیں‘‘ وہ شروع ہوا ’’اور تمہاری یہ ناگن، دایاں پاؤں اُٹھنے پر بائیں اور بایاں اُٹھنے پر دائیں طرف جھوم رہی تھی۔‘‘

میں اک دم کانشس ہو گئی۔ میں نے اپنی چوٹی کی طرف دیکھا جو اس وقت نہ جانے کیسے سامنے چلی آئی تھی۔ میں نے بغیر کسی ارادے کے سر کو جھٹکا دیا اور "ناگن" پھر پیچھے چلی گئی۔ جیسے پھنکارتی ہوئی۔ بڈھا کہے جا رہا تھا۔ "میں نے گاڑی آہستہ کر لی اور پیچھے سے تمھیں دیکھتا رہا۔"

اور آخر ایک دم بولا وہ بڈھا۔۔۔ "تم بہت خوبصورت لڑکی ہو!"

میرے بدن میں جیسے کوئی تکلّف پیدا ہو گیا اور میں کروٹ کروٹ اسے چرانے لگی۔ بڈھا منتر مگدھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نہ جانتی تھی، اس کی بات کا کیا جواب دوں؟ میں نے سنا ہے، باہر کے دیسوں میں کسی لڑکی کو کوئی ایسی بات کہہ دے تو وہ بہت خوش ہوتی ہے، شکریہ ادا کرتی ہے لیکن ہمارے یہاں کوئی ایسا رواج نہیں۔ اُلٹا ہمیں آگ لگ جاتی ہے۔۔۔ ہم کیسی بھی ہیں، کسی کو کیا حق پہنچتا ہے ہمیں ایسی نظروں سے دیکھے؟ اور وہ پھر یوں۔۔۔ سڑک کے کنارے، گاڑی روک کر، اور شروع ہو جائے۔ بدیس کی لڑکیوں کا کیا ہے، وہ تو بڈھوں کو پسند کرتی ہیں۔ اٹھارہ بیس برس کی لڑکی ساٹھ ستر کے بوڑھے سے شادی کر لیتی ہے۔

"یہ بڈھا آخر چاہتا کیا ہے؟" میں نے سوچا۔

”میں اس خوبصورتی کی بات نہیں کرتا۔“ وہ بولا۔ ”جسے عام آدمی خوبصورتی کہتے ہیں۔ مثلاً وہ گورے رنگ کو اچھا سمجھتے ہیں۔“

مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں میرا رنگ کوئی اتنا گورا بھی نہیں۔ سانولا بھی نہیں۔ بس۔۔۔ بیچ کا ہے۔ میں نے۔۔۔ میں تو شرما گئی۔ ”آپ؟“ میں نے کہا اور پھر آگے پیچھے دیکھنے لگی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟

بس دندناتی ہوئی آئی اور یوں پاس سے گزر گئی کہ کار اور اس کے بیچ انچ بھر کا ہی فرق رہ گیا۔ لیکن وہ بڈھا دنیا کی ہر چیز سے بے خبر تھا۔ آخر کو ہر ایک کو مرنا ہے، لیکن وہ اس وقت تو بیکار اور فضول موت سے بھی بے خبر تھا۔ جانے کن دنیاؤں میں کھویا ہوا تھا وہ؟

دو تین تھائی۔۔۔ راما لوگ وہاں سے گزرے، کسی نوکری پگار کے بارے میں جھگڑا کرتے ہوئے جو ایسٹر کی گھنٹی میں گم ہو گیا۔ دائیں طرف کے مکان کی بالکنی پر ایک دُبلی سی عورت اپنے بالوں میں کنگھی کرتی ہوئی آئی اور ایک بڑا سا گچھا بالوں کا کنگھی میں سے نکال کر نیچے پھینکتی ہوئی واپس اندر چلی گئی۔ کسی نے خیال بھی نہ کیا، سڑک کے کنارے میرے اور اس بُڈھے کے درمیان وہ کیا بریسق

چل رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ لوگ اسے میرا کوئی بڑا سمجھتے تھے۔ بوڑھا کہتا رہا۔۔۔ ”تمہارا یہ سنولایا ہوا، کُندنی رنگ، گٹھا ہوا بدن جو ہمارے ملک میں ہر لڑکی کا ہونا چاہیے۔“ اور پھر ایکا ایکی بولا۔۔۔ ”تمہاری شادی تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کرنا بھی تو کسی گبرو جوان سے۔“

”جی؟“

اب لہو میرے منہ کو آنے لگا تھا۔ آپ ہی سوچیے، آنا چاہیے تھا یا نہیں؟ پر اس سے پہلے کہ میں اس بُڈھے سے کچھ کہتی، اس نے ایک نئی ہی بات شروع کر دی۔۔۔ ”تم جانتی ہو، آج کل یہاں چور آئے ہوئے ہیں؟“

”چور!“ میں نے کہا ”کیسے چور؟“

”جو بچّوں کو چُرا کر لے جاتے ہیں۔ انہیں بے ہوش کر کے ایک گٹھری میں ڈال لیتے ہیں۔ ایک ایک وقت میں چار چار۔ پانچ پانچ۔“

میں بڑی حیران ہوئی۔ میں نے کہا بھی تو صرف اتنا۔۔۔ ”تو؟“ مطلب،

مجھے۔۔۔میرا اس بات سے کیا تعلق؟

جبھی اس بُڈھے نے کمر سے نیچے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”دیکھنا کہیں پولیس تمھیں ہی پکڑ کر نہ لے جائے۔“

اور اس کے بعد اس بُڈھے نے ہاتھ ہوا میں ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے چلا گیا۔ میں بے حد حیران کھڑی تھی۔۔۔ چور۔۔۔ گٹھری، جس میں چار چار، پانچ پانچ بچّے۔۔۔ جبھی میں نے خود بھی اپنے نیچے کی طرف دیکھا اور سمجھی۔۔۔ میں ایک دم جل اُٹھی۔۔۔ پاجی، کمینہ۔ شرم نہ آئی اسے؟ میں اس کی پوتی نہیں تو بیٹی کی عمر کی تو ہوں ہی اور یہ مجھ سے ایسی باتیں کر گیا، جو لوگ بدیس میں بھی نہیں کرتے۔ اسے حق کیا تھا ایک لڑکی کو سڑک کے کنارے کھڑی کرے اور ایسی باتیں کرے؟ کسی بھی عزت والی، سوا بھیمانی لڑکی سے۔ اس کی ہمّت کیسے پڑی؟ آخر کیا تھا مجھ میں؟ یہ سب مجھی سے کیوں کہا؟ ایک بے عزّتی کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ میں کیا ایک اچھے گھر کی لڑکی دکھائی نہیں دیتی؟ میں نے لباس بھی کوئی ایسا نہیں پہنا جو بازاری قسم کا ہو۔ قمیص تھوڑی فٹ تھی البتّہ، جیسی عام لڑکیوں کی ہوتی ہے اور نیچے شلوار۔ کیوں؟ یہ ایسا کیوں ہوا؟

ایسے کو تو پکڑ کر مارنا اور مار مار کر سُور بنا دینا چاہیے۔ پولیس میں اس کی رپورٹ کرنی چاہیے۔ آخر کوئی تک ہے۔۔۔ اس کی گاڑی کا نمبر؟ مگر جب تک گاڑی موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں بھی کتنی مورکھ ہوں، جو نمبر بھی نہیں لیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے میرے ساتھ، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وقت پر دماغ کام نہیں کرتا۔ بعد میں خیال آتا ہے تو خود ہی سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے سائیکالوجی کی کتاب میں پڑھا ہے، ایسی حرکت وہی لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کی عزّت کرتے ہیں، اپنی عزّت کرتے ہیں۔ اسی لیے مجھے وقت پر نمبر لینا یاد نہ آیا۔ میں رونکھی سی ہو گئی، سامنے سے پودار کالج کے کچھ لڑکے گاتے، سیٹیاں بجاتے ہوئے گزر گئے۔ انھوں نے تو ایک نظر بھی میری طرف نہ دیکھا مگر یہ بڈھا۔۔۔!

میں دراصل دادر اُون کے گولے خریدنے جا رہی تھی۔ میرا فسٹ کزن بیگل سویڈن میں تھا، جہاں بہت سردی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ میں کوئی آٹھ پلائی کی اُون کا سوئیٹر بُن کر اسے بھیج دوں۔ کزن ہونے کے ناتے وہ میرا بھائی تھا، لیکن تھا بدمعاش۔ اس نے لکھا۔۔۔ تمہارے ہاتھ کا بُنا ہوا سوئیٹر بدن پر رہے گا تو

سردی نہیں لگے گی۔۔۔مجھے گھر میں کوئی اور کام بھی تو نہ تھا۔بی اے پاس کر چکی تھی اور پاپا کہتے تھے، آگے پڑھائی کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں، اگر کسی لڑکی کو پروفیشن میں جانا ہو تو ٹھیک ہے، لیکن اگر ہر ہندوستانی لڑکی کی طرح سے شادی ہی اس کا پروفیشن ہے تو پھر کیا فائدہ؟ اس لیے میں گھر ہی میں رہتی اور آلتو فالتو کام کیا کرتی تھی، جیسے سوئیٹر بُننا یا بھیّا اور بھابی بہت رومینٹک ہو جائیں اور سینما کا پروگرام بنالیں تو پیچھے بِندو، اُن کی بچّی، کو سنبھالنا۔ اس کے گیلے کپڑوں، پوتڑوں کو دھونا سکھانا وغیرہ۔ لیکن بُڈھے سے اس مُڈبھیڑ کے بعد میں جیسے ہِل ہی نہ سکی۔ میرے پاؤں میں جیسے کسی نے سیسہ بھر دیا۔ پتہ نہیں آگے چل کر کیا ہو۔۔۔؟اور میں گھر لوٹ آئی۔

اتنی جلدی گھر لوٹتے ہوئے دیکھ کر ماں حیران رہ گئی۔اُس نے سمجھا میں اُون کے گولے خرید بھی لائی ہوں۔ لیکن میں نے قریب قریب روتے ہوئے اُسے ساری بات کہہ سنائی۔ اگر گول کر گئی تو وہ چار چار پانچ پانچ بچّوں والی بات۔ کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو بیٹی ماں سے بھی نہیں کر سکتی۔ماں کو بڑا غصّہ آیا اور وہ ہوا میں گالیاں دینے لگی۔ عورتوں کی گالیاں، جن سے مردوں کا کچھ نہیں بگڑتا اور

جوانہیں اور ایکسائیٹ کرتے ہیں۔ آخر ماں نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔۔۔ ”اب تجھے کیا بتاؤں، بٹیا۔ یہ مرد سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ کیا جوان، کیا بُڈھے؟“

”پر ماں۔“ میں نے کہا ”پاپا بھی تو ہیں۔“

ماں بولی۔۔۔ ”اب میرا منہ مت کھلواؤ۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھا نہیں تھا اُس دن۔۔۔ کیسے رامالِنگم کی بیٹی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔“

کچھ بھی ہو، ماں کے اس مردوے کے گالیاں دینے سے ایک حد تک میری تسلّی ہو گئی تھی۔ مگر بُڈھے کی باتیں رہ رہ کر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی۔۔۔ کہیں پھر مل جائے تو میں۔۔۔ اور اس کے بعد میں اپنی بے بسی پر ہنسنے لگی۔ جبھی میں اُٹھ کر اندر گئی۔ سامنے قدِ آدم آئینہ تھا جس کے سامنے میں رُک گئی اور اپنے سراپے کو دیکھنے لگی۔ کولھوں سے نیچے نظر گئی تو پھر مجھے اس کی چار چار پانچ پانچ بچّوں والی بات یاد آگئی اور میرے کانوں کی لویں تک گرم

ہونے لگیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا، پھر میں کس سے شرما رہی تھی؟ ہو سکتا ہے، بدن کا یہی حصّہ جسے لڑکیاں پسند نہیں کرتیں، مردوں کو اچھا لگتا ہو۔ جیسے لڑکے ایک دوسرے کے سیدھے اور ستواں بدن کا مذاق اڑاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ عورتوں کو اچھا لگتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد کو سوکھا سڑا ہونا چاہیے۔ نہیں، ان کا بدن ہو تو اوپر سے پھیلا ہوا۔ مطلب چوڑے کاندھے، جھکی چھاتی اور مضبوط بازو۔ البتّہ نیچے سے سیدھا اور ستواں۔

پاپا ایکا ایکی بیچ والے کمرے میں چلے آئے، جہاں میں کھڑی تھی اور خیالوں کا وہ تار ٹوٹ گیا۔ پاپا آج بڑے تھکے تھکے سے نظر آرہے تھے۔ کوٹ جو وہ پہن کر دفتر گئے تھے، کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔ ٹوپی کچھ پیچھے سرک گئی تھی۔ انہوں نے اندر آکر ایسے کہا۔۔ ”بٹیا“ اور پھر ٹوپی اُٹھا کر اپنے گنجے سر کو کھجایا۔ ٹوپی پرے رکھنے کے بعد وہ باتھ روم کی طرف چلے گئے، جہاں انہوں نے قمیص اتاری۔ ان کی بنیان پسینے سے پٹی تھی۔ پہلے تو انہوں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر اوپر طاق سے یوڈی کلون نکال کر بغلوں میں لگائی اور ایک نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے لوٹ آئے اور جیسے بے فکر ہو کر خود کو صوفے میں گرا دیا۔ ماں نے

پوچھا۔۔۔ ”شکنجبین لوگے؟“ جس کے جواب میں انہوں نے کہا۔۔۔ ”کیوں؟ وہسکی ختم ہوگئی؟ ابھی پرسوں ہی تولایا تھا، میکن کی بوتل۔“

جب میں بوتل اور گلاس لائی تو ماں اور پاپا آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ میرے آتے ہی وہ خاموش ہو گئے۔ میں ڈر گئی۔ مجھے یوں لگا، جیسے وہ اُس بُڈھے کی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن نہیں۔۔۔ وہ چچا گووند کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ آخری بات سے مجھے یہی اندازہ ہوا چچا اندر سے کچھ اور ہیں، باہر سے کچھ اور۔

پھر کھاناوانا۔۔۔ جس میں رات ہو گئی۔ بیچ میں بے موسم کی برسات کا کوئی چھینٹا پڑ گیا تھا اور گھر کے سامنے لگے ہوئے اشوک پیڑ کے پتّے، گرے گرے اور لمبوترے تھے، زیادہ ہرے اور چمکیلے ہو گئے تھے۔ سڑک پر کی کمیٹی کی بتّی اور اس کی روشنی ان پر پڑتی تھی تو وہ چمک چمک جاتے تھے۔ ہوا ایک ساتھ نہیں چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھونکوں میں آرہی ہے اور جب اشوک کے پتّوں پر جھونکا آتا، شاں شاں کی آواز پیدا ہوتی، تو یوں لگتا جیسے ستار کا جھالا ہے۔ نانکو۔۔۔ نوکر نے بستر لگا دیا تھا۔ میری عادت تھی کہ اِدھر بستر پر لیٹی،

اُدھر سو گئی۔ لیکن اُس دن نیند تھی کہ آہی نہ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ سڑک پر کی روشنی عین میرے سرہانے پہ پڑتی تھی اور جب میں دائیں کروٹ لیتی تو وہ میری آنکھوں میں کھبنے لگتی۔ میں نے آنکھیں لوٹ کر دیکھا تو بجلی کا بلب ایک چھوٹا سا چاند بن گیا تھا، جس میں ہالے سے باہر کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر بیڈ کو تھوڑا پرے سرکا لیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کرنیں وہیں تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ خود میرے اپنے اندر سے پھوٹ رہی تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں، جیوتی شبد ہو جاتا ہے اور شبد جیوتی۔ جبھی وہ کرنیں آواز میں بدل گئیں، اس بُڈھے کی آواز میں!

"دھت!" میں نے کہا اور اسی کروٹ پر لیٹے لیٹے مَن میں گائیتری کا پاٹھ کرنے لگی۔ لیکن وہی کرنیں چھوٹے چھوٹے، گول گول، گدرائے گدرائے بچوں کی شکل میں بدلنے لگیں۔ ان کے پیچھے گبرو جوان کا چہرہ نظر آ رہا تھا، لیکن دھندلا دھندلا سا جیسے وہ ان بچّوں کا باپ تھا۔ اس کی شکل اس بُڈھے سے ملتی جُلتی تھی۔۔۔ نہیں تو۔۔۔

جبھی اُس نوجوان کی شکل صاف ہونے لگی۔ وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی بتیسی کتنی سفید

اور پکّی تھی۔ اس نے فوج کی لیفٹینٹ کی وردی پہن رکھی تھی۔ نہیں۔۔۔ پولیس انسپکٹر کی۔ نہیں۔۔۔ سکرٹ، ایوننگ سوٹ، جس میں وہ بے حد خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے ٹیچر کا بتایا ہوا نسخہ استعمال کرنا شروع کیا۔۔۔ اپنی نیندیں واپس لانے کے لیے۔ میں فرضی بھیڑیں گننے لگی۔ مگر بے کار تھا، سب کچھ بے کار۔ پرماتما جانے اُس بُڈھے نے کیا جادو جگا دیا تھا یا میری اپنی ہی قسمت پھوٹ گئی تھی۔ اچھی بھلی جا رہی تھی، اُون کے گولے خریدنے، بیگل کے لیے۔۔۔ بیگل! دھت۔۔۔ وہ میرا بھائی تھا۔ پھر گولے کی اُون کے موٹے موٹے اور بٹے ہوئے دھاگے پتلے ہو گئے۔ مکڑی کے جال کی طرح سے اور میرے دماغ میں اُلجھ گئے۔ پھر جیسے سب صاف ہو گیا۔ اب سامنے ایک چٹیل سا میدان تھا، جس میں کوئی ولی، اوتار بھیڑیں چرا رہا تھا۔ وہ بش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔۔۔ تندرست، مضبوط اور خوب صورت۔ ایک لا اُبالی پن میں اُس نے شرٹ کے بٹن کھول رکھے تھے اور چھاتی کے بال صاف اور سامنے نظر آ رہے تھے، جن میں سر رکھ کر اپنے دکھڑے رونے میں مزا آتا ہے۔ وہ بھیڑیں کیوں چرا رہا تھا؟ اب بھی مجھے یاد ہے وہ بھیڑیں گنتی میں تہتر تھیں۔ میں سو گئی۔

مجھے کچھ ہو گیا۔ نہ صرف یہ کہ میں بار بار خود کو آئینے میں دیکھنے لگی بلکہ ڈرنے بھی۔ بچے بری طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور میں پکڑے جانے کے خوف سے کانپ رہی تھی۔ گھر میں میرے رشتے کی باتیں چل رہی تھیں۔ روز کوئی نہ کوئی دیکھنے دکھانے کو چلا آتا تھا۔ لیکن مجھے ان میں سے کوئی بھی پسند نہ تھا۔ کوئی ایسے ہی مر امر نکلا تھا اور کوئی تندرست بھی تھا تو اس نے کنویکس شیشوں والی عینک پہن رکھی تھی۔ اس نے صاحب کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔۔۔ کی ہو گی۔ نہیں چاہیے کیمسٹری۔ ان میں سے کوئی بھی تو نہیں تھا، جو میری نظر میں بچ سکے، جو اب تک میری نہیں، اُس بُڈھے کی نذر ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا، اب سینما تماشے میں جانے کو بھی میرا مَن نہ چاہتا تھا، حالانکہ شہر میں کئی نئی اور اچھی پکچریں لگی تھیں اور وہی ہیرو لوگ ان میں کام کر رہے تھے، جو کل تک میرے چہیتے تھے۔ لیکن اب ایکا ایکی وہ مجھے سِسی دکھائی دینے لگے۔ وہ ویسے ہی پیڑ کے پیچھے سے گھوم کر لڑکی کے پاس آتے تھے اور عجیب طرح کی زنانہ حرکتیں کرتے ہوئے اسے لُبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ بھلا مرد ایسے تھوڑے ہوتے ہیں؟ عورت کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔۔۔ اُسے موقع ہی نہیں

دیتے کہ وہ ان کے لیے روئے، تڑپے۔ حد ہے نا؟ مرد ہی نہیں جانتے کہ مرد کیا ہے؟ ان میں سے ایک بھی تو میری کسوٹی پہ پورا نہ اترتا تھا۔۔۔جو میری کسوٹی بھی نہ تھی۔

انہی دنوں میں نے اپنے آپ کو کوپرتج کے میدان میں پایا، جہاں ہند اور پاکستان کے بیچ ہاکی میچ ہو رہا تھا۔ پاکستان کے گیارہ کھلاڑیوں میں سے کم از کم چار پانچ تو ایسے تھے جو نظروں کو لوٹے لیتے تھے۔ اِدھر ہند کی ٹیم میں اتنے ہی۔۔۔ چار پانچ، جن میں سے دو سکھ تھے۔ چار پانچ ہی کیوں؟ مجھے ہنسی آئی۔۔۔ پاکستان کا سنٹر فارورڈ عبد الباقی۔۔۔ کیا کھلاڑی تھا۔ اس کی ہاکی کیا تھی، چمبک پتھّر تھی جس کے ساتھ گیند چمٹا ہی رہتا تھا۔ یوں پاس دیتا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ چلتا تو یوں جیسے نو مینز لینڈ میں جا رہا ہے۔ ہندوستانی سائیڈ کے گول پر پہنچ کر ایسا زبردست نشانہ بٹھاتا کہ گولی کی سب محنتیں بے کار، گیند پوسٹ کے پار۔۔۔ گول! تماشائی شور مچاتے۔ بمبئی کے مسلمان نعرے لگاتے، بغلیں بجاتے۔ یہی نہیں، اُتری بھارت کے ہندوستانی بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ ہندوستانی ٹیم کا شنگار آنند تھا۔۔۔ کیا کارنر لیتا تھا۔ جب اُس نے گول کیا تو اس سے بھی

زیادہ شور ہوا۔ اب دونوں طرف کے فاؤل کھیلنے لگے۔ وہ آزادانہ ایک دوسرے کے ٹخنے، گھٹنے توڑنے لگے، لیکن میچ چلتا رہا۔

پاکستانی ٹیم ہندوستان پر بھاری تھی۔ ان میں سے کسی کے ساتھ لَو لگانا بھی ٹھیک نہ تھا۔ جات تو جات، وہ ہمارے دیس کے بھی نہ تھے۔ لیکن ہر وہ چیز انسان کو ایکسائٹ کرتی ہے، جسے کرنے سے اُسے منع کیا جائے۔ ہندو لڑکی کسی مسلمان کے ساتھ شادی کر لیتی ہے یا مسلمان یا سِکھ کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو کیا شور مچتا ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا تو اس لڑکی سے، کہ اسے کیا تکلیف تھی۔ چاہے وہ لڑکی خود ہی بعد میں کہے۔۔۔ کیا ہندو، کیا مسلمان اور کیا سِکھ۔ سب ایک ہی سے کمینے ہیں۔ ہندوستانی ٹیم میں ایک اسٹینڈ بائی تھا، جو سب سے زیادہ خوبصورت تھا اور گبرو جوان۔۔۔ اسے کِھلا کیوں نہیں رہے تھے؟

کھیل کے بعد جب میں آٹو گراف لینے کے لیے کھلاڑیوں کے پاس گئی، تو اپنی کاپی اس اسٹینڈ بائی کے سامنے بھی کر دی جس سے وہ بہت حیران ہوا۔ وہ تو کھیلا ہی نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔۔۔ تم کھیلو گے۔ ایک دن کھیلو گے۔ کوئی بیمار پڑ جائے گا، مگر۔۔۔ تم کھیلو گے۔ سب کو مات دو گے۔ ٹیم کے کیپٹن ہو گے!

اسٹینڈ بائی کا تو جیسے دل پگھل کر باہر آ گیا۔ نم آنکھوں سے اُس نے میری طرف دیکھا، جیسے میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، وہ بھوِش وانی ہے۔۔۔ اور وہ تھی بھی کیوں کہ وہ سب کچھ میں تھوڑے کہہ رہی تھی؟ میرے اندر کی کوئی چیز تھی جو مجھے مجبور کر رہی تھی، وہ سب کہنے کو۔ پھر میں نے اسے چائے کی دعوت دی، جو اس نے مان لی اور میں اسے ساتھ لے کر گیلارڈ پہنچ گئی۔ جب میں اس کے ساتھ چل رہی تھی تو ایک سنسناہٹ تھی، جو میرے پورے بدن میں دوڑ دوڑ جاتی تھی۔ کیسے ڈر خوشی ہو جاتا ہے اور خوشی ڈر۔ میں نے چذیری کی جو ساری پہن رکھی تھی، بہت پتلی تھی۔ مجھے شرم آ رہی تھی اور شرم کے بیچ میں ایک مزا۔ کبھی کبھی مجھے یاد آتا تھا اور پھر بھول بھی جاتی تھی کہ لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ آخر دنیا میں کوئی نہیں تھا، میرے اور اُس اسٹینڈ بائی کے سوا جس کا نام جے کشن تھا لیکن اُسے سب پرونٹو کے نام سے پکارتے تھے۔

جبھی ہم دونوں گیلارڈ پہنچ گئے اور ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کے وجود سے ہم دونوں جیسے شرابی ہو گئے تھے۔ ہم ساتھ لگ کے بیٹھے تھے کہ پرے ہو گئے اور پھر ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ بدنوں میں سے کوئی بو مہک رہی تھی۔۔۔

سوندھی سوندھی، جیسے تنور میں پڑی ہوئی روٹی سے اُٹھتی ہے۔ میں چاہتی تھی کچھ ہو جائے ہم دونوں کے بیچ۔۔۔پیار، جیسے پیار کوئی آلا کارت ڈِش ہوتی ہے۔ چائے آئی، جسے پیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ چور نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔۔۔ میرے بدن کے اس حصّے کو جہاں اُس بُڈھے کی نظریں ٹِکی تھیں۔ وہ بڈھا تھا؟ ماں نے کہا تھا۔۔۔ مرد سب ایک ہی سے ہوتے ہیں، کیا جوان اور کیا بُڈھے؟

ہو سکتا تھا ہماری بات آگے بڑھ جاتی۔ لیکن پرونٹو نے سب بنٹا دھار کر دیا۔ پہلے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے دبا دیا۔ جسے میں پیار کی بارہ کھڑی سمجھی۔ لیکن اس کے بعد وہ سب کی نظریں بچا کر اپنا ہاتھ میرے شریر کے اُس حصّے پہ دوڑانے لگا، جہاں عورت مرد سے جدا ہونے لگتی ہے۔ میرے تن بدن میں کوئی آگ سی لپک آئی اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔۔۔ نفرت کی، محبت کی۔ میرا چہرہ لال ہونے لگا۔ میں باتیں بدلنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا، تو اس نے مایوس ہو کر، رات بیک بے میں ملنے کی دعوت دی، جسے فوراً مانتے ہوئے میں نے ایک طرح سے انکار کر دیا۔ وہ 'مجھے' عورت کو بالکل غلط سمجھ گیا

تھا، جو ڈھرّے پر تو آتی ہے مگر سیدھے نہیں۔ اس کی تو گالی بھی سیدھی نہیں ہوتی۔ بے حیا مرد کی گالی کی طرح۔ اس کا سب کچھ گول گول ہوتا ہے، ٹیڑھا ٹیڑھا۔ روشنی سے وہ گھبراتی ہے۔ اندھیرے سے اسے ڈر لگتا ہے۔ آخر اندھیرا رہتا ہے نہ ڈر، کیوں کہ وہ ان آنکھوں سے پرے، ان روشنیوں سے پرے ایک ایسی دنیا میں ہوتی ہے جو بالغوں کی دنیا یوگ کی دنیا ہوتی ہے، جسے آنکھوں کے بیچ کی تیسری آنکھ ہی گھور سکتی ہے۔

گیلارڈ سے باہر نکلے تو میرے اور پرونٹو کے بیچ سوائے تندرستی کے اور کوئی بات سانجھی نہیں رہ گئی تھی۔ میرے کھسیائے ہونے سے وہ بھی کچھ کھسیا چکا تھا۔ جبھی سڑک پر جاتی ہوئی ایک ٹیکسی کو میں نے روکا۔ پرونٹو نے بڑھ کر میرے لیے دروازہ کھولا اور میں لپک کر اندر بیٹھ گئی۔

"بیک بے۔" پرونٹو نے مجھے یاد دلایا۔

میں نے طوطے کی طرح سے رٹ دیا۔۔۔ "بیک بے۔" اور ٹیکسی ڈرائیور کی طرف منہ موڑتے ہوئے بولی۔۔۔ "ماہم۔"

ڈرائیور نے پیچھے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرانی تھی۔

"بیک بے نہیں؟" وہ بولا۔

"نہیں۔" میں نے کرخت سی آواز میں جواب دیا۔۔۔ "ماہم۔"

"آپ تو ابھی۔۔۔"

"چلو، جہاں میں کہتی ہوں۔"

ٹیکسی چلی تو پرونٹو نے میری طرف ہاتھ پھیلایا، جو اتنا لمبا ہو گیا کہ محمد علی روڈ، بھائی کھلہ، پریل، دادر، ماہم، سیتلا دیوی ٹمپل روڈ تک میرا پیچھا کرتا، مجھے گدگداتا رہا۔ آخر میں گھر پہنچ گئی۔

اندر، یادو بھیّا ایک جھٹکے کے ساتھ بھابی کے پاس سے اُٹھے۔ میں سمجھ گئی کیونکہ ماں کا کڑا حکم تھا کہ میرے سامنے وہ اکٹھے نہ بیٹھا کریں۔۔۔ "گھر میں جوان لڑکی ہے۔"

میں نے لپک کر بِندو کو جھولے میں سے اُٹھایا اور اس سے کھیلنے لگی۔ بِندو مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ ایک پل کے لیے تو میں گھبرا گئی۔۔۔ جیسے اُسے سب کچھ معلوم

تھا۔ کچھ لوگ کہتے بھی ہیں کہ بچوں کو سب پتہ ہوتا ہے۔ صرف وہ کہتے نہیں۔

گھر میں گووند چاچا بھی تھے جو پاپا کے ساتھ اسٹڈی میں بیٹھے تھے اور ہمیشہ کی طرح سے ماں کی جان ناک میں کیے ہوئے تھے۔ عجیب تھا دیور بھابی کا یہ آپسی رشتہ۔ جب ملتے تھے ایک دوسرے کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ لڑنے جھگڑنے، گالی گلوچ کے سوا کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ پاپا ان کی لڑائی میں کبھی دخل نہ دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے نا کہ ایک روز کی بات ہو تو کوئی بولے بکے بھی۔ لیکن روز روز کا یہ جھگڑا کون مٹائے؟ اور وہ سب ٹھیک ہی تو تھا، کیوں کہ اس ساری لے دے کے باوجود ماں اتنا سا بھی بیمار ہوتی تو ہمیشہ گووند ہی کو یاد کرتی۔ اور بھی تو دیور تھے ماں کے، جن کے بیچ "پائے لاگن" اور "جیتے رہو" کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ وہ ماں کو تحفوں کی گھوس بھی دیتے تھے، لیکن وہاں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ دینا تو ایک طرف گووند چاچا ماں کو ٹھگتے ہی رہتے تھے، لیکن اس پر بھی وہ اسے سب سے سوا سمجھتی تھی۔ اور وہ لے کر اُلٹا ماں کو یہ احساس دلاتے تھے جیسے اس کے مِتّروں پہ کوئی احسان کر رہے ہیں۔ کئی بار ماں نے کہا۔۔۔ گووند اس لیے اچھا ہے کہ اس کے دل میں کچھ نہیں۔ اور پاپا جواب میں ہمیشہ یہی کہتے تھے۔۔۔ دماغ میں بھی

کچھ نہیں۔ اور ماں اس بات پر لڑنے، مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی۔ اور جب وہ گووند چاچا سے اپنی دیورانی کے بارے میں پوچھتی۔۔۔ تم اجیتا کو کیوں نہیں لاتے؟ تو یہی جواب ملتا۔۔۔ کیا کروں لاکر؟ پھر تم سے اس کی چوٹی کھنچوانا ہے؟ جلی کٹی سنوانا ہے۔۔۔ ماں جواب میں گالیاں دینے لگتی، گالیاں کھاتی اور چاچا کے چلے جانے کے بعد دھاڑیں مار کر روتی اور پھر وُہی۔۔۔ کہاں ہے گووندا؟ اسے بلاؤ۔ میرا تو اس گھر میں وہی ہے۔ اپنے پاپا کا کیا پوچھتی ہو؟ وہ تو ہیں ہی بھولے مہیش، گوبر گنیش۔ ان کے تو کوئی بھی کپڑے اتروالے۔۔۔ اور یہ میں نے ہر جگہ دیکھا ہے، ہر بیوی اپنے میاں کو بہت سیدھا، بہت بے وقوف سمجھتی ہے۔ اور وہ چُپ رہتا ہے۔ شاید اسی میں اس کا فائدہ ہے۔

اس دن گووند چاچا ڈائریکٹر جنرل شپنگ کے دفتر میں کام کرنے والے کسی مسٹر سولنکی کی بات کر رہے تھے اور اصرار کر رہے تھے۔۔۔ ''میری بات آپ کو ماننا پڑے گی۔''

''تم بِجنس مین ہونا۔'' ماں کہہ رہی تھی ''اس میں بھی کوئی سوارتھ ہو گا تمہارا۔''

اس پر گووند چاچا جل بھُن گئے۔ چِلّاتے ہوئے اُنہوں نے کہا ''تم کیا سمجھتی ہو،

کامنی تمہاری بیٹی ہے، میری نہیں ہے۔"

جب مجھے پتہ چلا کہ وہ مسٹر سولنکی کے لڑکے کے ساتھ میرے ہی رشتے کی بات چل رہی ہے اور اس کے بعد کنڈم اسپنڈل کی طرح سے اور بھی دھاگے کھُلنے لگے، جن کا مجھے آج تک پتہ نہ تھا۔ گووند چاچا کے منہ پر جھاگ تھے اور وہ بک رہے تھے۔ "تو۔۔۔ تو نے اجیتا کے ساتھ میری شادی کر دی، میں نے آج تک چوں چرا کی؟ کہتی ہے، میری مائیکے سے ہے، دور کے میرے ماما کی لڑکی ہے۔۔۔ کہاں رکھوں؟ زندگی کیا آنکھوں سے بناتے ہیں؟ وہی آنکھیں اب وہ مجھے دکھاتی ہے۔ اور تو اور، تمہیں بھی دکھاتی ہے۔"

پہلی بار میں نے گووند چاچا کا بریک ڈاؤن دیکھا۔ میں سمجھتی تھی وہ آدرش آدمی ہیں اور اجیتا چاچی سے پیار کرتے ہیں۔ آج یہ راز بھی کھُلا کہ ان کے ہاں بچّہ کیوں نہیں ہوتا۔ کینٹب نیو جن تو ایک نام تھا۔

ماں نے کہا۔۔۔ "کامنی تمہاری بیٹی ہے۔ اسی لیے تو نہیں چاہتی اسے کسی بھی کھڈے میں پھینک دو۔"

میرا خیال تھا کہ اس پر اور تو تو میں میں ہو گی۔ اور گووند چاچا بائیں بازو کی پارٹی کی طرح سے واک آؤٹ کر جائیں گے۔ لیکن وہ اُلٹا قسمیں کھانے لگے۔۔۔
"تمہاری سوگند بھابی۔ اس سے اچھا لڑکا تمہیں نہ ملے گا۔ وہ بڑودہ کی سنٹرل ریلوے ورکشاپ میں فورمین ہے۔ بڑی اچھی تنخواہ پاتا ہے۔"

میں سب کچھ سُن رہی تھی اور اپنے آپ میں جھلّا رہی تھی۔ لڑکا اچھا ہے، تنخواہ اچھی ہے لیکن شکل کیسی ہے، عقل کیسی ہے، عمر کیا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی کچھ کہتا ہی نہیں۔ فورمین بنتے بنتے تو برسوں لگ جاتے ہیں۔ یہ ہمارا دیس۔ پچاس سال کا مرد بھی بیاہنے آئے تو یہاں کی بولی میں اُسے لڑکا ہی کہتے ہیں۔ اس کی صحت کیسی ہے۔ کہیں انٹلکچوئل تو نہیں معلوم ہوتا۔ جبھی مجھے پرونٹو کا خیال آیا، جو اس وقت بیک بے پر میرا انتظار کر رہا ہو گا۔۔۔ اسٹینڈ بائی! جو زندگی بھر اسٹینڈ بائی ہی رہے گا۔ کبھی نہ کھیلے گا۔ اُسے کھیل آتا ہی نہیں۔ اس میں صبر ہی نہیں۔ پھر مجھے اس غریب پر ترس آنے لگا۔ جی چاہا بھاگ کر اس کے پاس چلی جاؤں۔ اسے تو میں نے دیکھا اور پسند بھی کیا تھا، لیکن اس فورمین کو جو بیک گراؤنڈ میں کہیں مسکرا رہا تھا۔

پھر جیسے من کے اندھیرے میں مچھّر بھنبھنانے لگے۔ مس گیتا سے مسز سولنکی کہلائی تو کیسی لگوں گی۔۔۔ بکواس!

گووند چاچا کہہ رہے تھے۔۔۔ لڑکا تن کا اُجلا ہے، من کا اُجلا ہے۔ اس کی آتما کتنی اچھی ہے اس کا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچّوں سے پیار کرتا ہے، بچّے اُس پر جان دیتے ہیں، اس کے اِرد گرد منڈلاتے۔۔۔ ہی ہی، ہو ہو، ہاہا کرتے رہتے ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ غی غی، غُو غُو، غاں غاں۔۔۔

بس۔۔۔ میں اندر کے کسی سفر سے اتنا تھک چکی تھی کہ رات مجھے بھیڑیں گننے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ ایک سپاٹ، بے رنگ، بے خواب سی نیند آئی مجھے، جو لمبے رَت جگوں کے بعد آتی ہے۔

دو ہی دنوں میں وہ لڑکا گھر پہ موجود تھا۔ ارے؟۔۔۔ میرے سب اندازے کتنے غلط نکلے۔ وہ ہاکی ٹیم کے لڑکوں، کیا کھیلنے والے اور کیا اسٹینڈ بائی۔ ان سب س زیادہ گبرو، زیادہ جوان تھا۔ اس نے صرف کسرت ہی نہ کی تھی، آرام بھی کیا تھا۔ اس کا چہرہ اندر کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا اور رنگ کندنی تھا۔۔۔ میری طرح۔ مضبوط دہانہ، مضبوط دانتوں کی بیڑھ۔ جیسے بے شمار گنّے چوسے ہوں، گاجر

مُولیاں کھائی ہوں، شاید کچّے شلجم بھی۔ وہ گھبرا رہا تھا ایک طرف اور اپنی گھبراہٹ کو بہادری سے چھپا رہا تھا دوسری طرف۔ آتے ہی اس نے مجھے نمستے کی، میں نے جواب میں کر ڈالی۔ماں کو پرنام کیا۔جب وہ میری طرف نہ دیکھتا تھا، تو میں اسے دیکھ لیتی تھی۔ یہ اچھا ہوا کسی کو پتہ نہ چلا۔ میری ٹانگیں کپکپانے لگی ہیں۔ دل دھڑام سے شریر کے اندر ہی کہیں نیچے گر گیا ہے۔ آج کل کی لڑکی ہونے کے ناتے مجھے ہسٹریا کا ثبوت نہ دینا تھا، اس لیے ڈٹی رہی۔ بیچ میں مجھے خیال آیا، ایسے ہی بے کار کی بغاوت کر دی ہے، میں نے تو اپنے بال بھی نہیں بنائے۔

اس کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی اور بچھی جا رہی تھی، جیسے بیٹوں کی شادی سے پہلے مائیں بچھتی ہیں۔ مجھے تو ایسے لگا جیسے وہ لڑکا نہیں، اس کی ماں مجھ پہ مر مِٹی ہے اور جانے مجھ میں اپنے ہوش کا کیا دیکھ رہی ہے؟ اس کی اپنی صحت بہت خراب تھی اور وہ اپنی کبھی کی خوبصورتی اور تندرستی کی باتیں کر کے اپنے بیٹے کے لیے مجھے مانگ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے اپنے ''مال'' پر بھروسہ نہیں۔۔۔ وہ بھکارن! کہہ رہی تھی لڑکوں کی خوبصورتی کس نے دیکھی

ہے ؟ لڑکے سب خوبصورت ہوتے ہیں۔ بس اچھے گھر کے ہوں، کماؤ ہوں۔۔۔ اور وہ اپنی ماں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ اس کے ساتھ کوئی بہت بڑا ظلم کر رہی ہے۔ میری ماں کے کہنے پر وہ کچھ شرماتا ہوا میرے پاس آکے بیٹھ گیا اور "باتیں کرو" کے حکم سے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو میں چُپ رہی اور جب بولی تو صرف یہ ثابت ہوا کہ میں گونگی نہیں ہوں۔ سفید قمیص، سفید پتلون اور سفید ہی بوٹ پہنے وہ کرکٹ کا کھلاڑی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کیپٹن نہیں تو بیٹس مین ہو گا، نہیں بولر۔۔۔ بولر، جو تھوڑا پیچھے ہٹ کر آگے آتا ہے۔ اور بڑے زور کے سسپنس سے گیند کو پھینکتا ہے اور وکٹ صاف اُڑ جاتی ہے۔ ہاں بیٹس مین اچھا ہو تو چوکسی کے ساتھ گیند کو باؤنڈری سے بھی پرے پھینک دیتا ہے، نہیں تو خود ہی آؤٹ۔

ماں کے اشارے پہ میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ چائے پئیں گے ؟"

"جی ؟" اس نے چونک کر کہا اور پھر جیسے میری بات کہیں بھوگول کا چکر کاٹ کر اس کے دماغ میں لوٹ آئی اور وہ بولا۔ "آپ پئیں گی ؟"

میں ہنس دی۔۔۔ "میں نہ پیوں گی تو کیا آپ نہیں پئیں گے ؟"

”آپ پئیں گی تو میں بھی پی لوں گا۔“

میں حیران ہوئی، کیوں کہ وہ بھی ایسا ہی تھا جیسے میرے پاپا۔۔۔ماں کے سامنے۔ لیکن ایسا تو بہت بعد میں ہوتا ہے، یہ شروع ہی میں ایسا ہے۔

چائے بنانے کے لیے اُٹھی تو سامنے آئینے پر میری نظر گئی۔۔۔وہ مجھے جاتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ساری سے اپنے بدن کو چھپایا۔ اور پھر مجھے اس بُڈھے کے الفاظ یاد آ گئے۔۔۔ ”آج کل یہاں چور آئے ہوئے ہیں۔۔۔ دیکھنا کہیں پولیس تمہیں ہی پکڑ کر نہ لے جائے۔“

بس، کچھ ہی دنوں میں میں پکڑی گئی۔ شادی ہو گئی میری۔ میرے گھر کے لوگ۔۔۔یوں تو بڑے آزاد خیال ہیں، لیکن دیدے پہ بٹھاتے ہوئے انھوں نے جیسے مجھے بوری میں ڈال رکھا تھا تا کہ میرے ہاتھ پاؤں پر کسی کی نظر ہی نہ پڑے۔ میں پردے کو پسند کرتی ہوں، لیکن ایک حد تک۔ مثلاً گھونگھٹ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے لیکن صرف اتنا جس میں دکھائی بھی دے اور شرم بھی رہے۔ زندگی میں ایک ہی بار تو ہوتا ہے کہ وہ دبے پاؤں آتا ہے اور کانپتے ہاتھوں سے اس گھونگھٹ کو اُٹھاتا ہے جسے بیچ میں سے ہٹائے بنا پرماتما بھی نہیں ملتا۔

شادی کے ہنگامے میں میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔۔۔ کون آیا، کون گیا؟ بس چھوٹے سولنکی میرے من میں سمائے ہوئے تھے۔ میں نے جو بھی کپڑا، جو بھی زیور پہنا تھا، جو بھی افشاں چُنی تھی، انہی کی نظروں سے دیکھ کر۔ جیسے میری اپنی نظریں ہی نہ رہی تھی؟ میں سب سے بچنا، سب سے چھُپنا چاہتی تھی تاکہ صرف ایک کے سامنے کھُل سکوں، ایک پہ اپنا آپا وار سکوں۔ جب برات آئی تو میری فرینڈز نے بہت کہا۔۔۔ بالکونی پر آجاؤ، برات دیکھ لو۔ لیکن میں نے ایک ہی نہ پکڑ لی۔ میں نے ایک روپ دیکھا تھا، جس کے بعد کوئی دوسرا روپ دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

آخر میں نے سسرال کی چوکھٹ پر قدم رکھا۔ سب میرے سواگت کے لیے کھڑے تھے۔ گھر کی عورتیں، مرد۔۔۔ بچوں کی ہنسی سنائی دے رہی تھی اور وہ مجھے گھونگھٹ میں سے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ سب رسمیں ادا ہوئیں، جیسی کہ ہر شادی میں ہوتی ہیں۔ لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میری شادی اور ہے، میرا گھونگھٹ اور، میرا ابرَ اور۔ گھر کے ایشٹ دیو کو ماتھا ٹکانے کے بعد میری ساس مجھے اپنے کمرے میں لے گئی، تاکہ میں اپنے سسر کے

پاؤں چھوؤں، ان سے اسیس لوں۔ کچھ اور شرماتے، کچھ اور سر جھکاتے ہوئے میں نے ان کے چرنوں کو ہاتھ لگایا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے۔۔۔

"سو تم۔۔۔ آ گئیں، بیٹی؟"

میں نے تھوڑا چونک کر اس آواز کے مالک کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ کچھ اور بھی آنسو ہوتے تو میں اُن قدموں کو دھو دھو کر پیتی۔

جنازہ کہاں ہے

کہیں سے سِسکیوں کی آواز آرہی ہے۔ کہیں کوئی رو رہا ہے اور میں گھبرا کر جاگ اُٹھتا ہوں۔۔۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔۔۔

نہیں تو۔ میرا لڑکا تو سو رہا ہے۔ شاید۔۔۔ میں اس کے بیڈ روم میں جا کر اپنا کان اس کے منہ کے پاس لے جاتا ہوں۔ وہ سو رہا ہے، مزے کی نیند۔ پھر یہ کس کے رونے، کس کے سسکیاں لینے کی آواز ہے؟ ایسی ہی ایک آواز، بلکہ آوازیں میں نے برسوں پہلے سنی تھیں۔ وہ دن، وہ قہر کا عالم، آپ کو بھی یاد ہو گا، جب دن کو

سورج ڈوبا تھا اور ہر چہار سو، سے ہائے ہائے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ جب گاندھی جی کا قتل ہوا تھا۔

یہ آواز۔۔۔ کہیں خفتی، میری بیوی کی تو نہیں؟ نہیں اس کی آواز کیسے ہو سکتی ہے یہ؟ وہ تو یہاں بمبئی سے ہزار میل دور پنجاب کے کسی گاؤں میں بیٹھی ہے۔ اپنے بھائی کے پاس۔ ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے یہ اسی کی آواز ہو، جو زمان و مکان کی وسعتوں کو چیرتی پھاڑتی ہوئی میری سائیکی میں چلی آئی ہو، کیوں کہ میں نے قریب قریب اُسے چھوڑ رکھا ہے۔ میں کیا کرتا؟ وہ بہت زیادہ بکواس کرنے لگی تھی اور سوال سے پہلے ہی جواب دینے لگتی تھی۔ اس لیے میں نے اُس کا نام خفتی رکھ دیا تھا۔ حالانکہ وہ دُلاری ہے، ایک سیدھی سادی گھریلو عورت۔ لیکن کیا آج کی عورت کے لیے صرف گھریلو ہونا کافی ہے؟

گھریلو عورت!۔۔۔ گھریلو عورت وہی ہوتی ہے نا جو گھر ہی میں رہے۔ میاں کے لیے روٹیاں پکائے۔ سفر سے اس کی واپسی پر اس کے بوٹ کے تسمے کھولے، اس کا بستر بچھائے اور اشارہ پاتے ہی اس پہ چلی آئے۔ نتیجہ؟۔۔۔ بچّے، پھر اور بچّے۔ لیکن باہر کی ہوا اُسے نہ لگنے پائے، جس سے پھپھوندی لگ جائے۔ جب اسے اور

کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تو کیا وہ دیواروں سے لڑے گی، دروازوں سے ٹکرائے گی۔ کچھ دن کے بعد یوں معلوم ہو گا، جسے آپ نے عورت سمجھ کر شادی کی تھی، وہ چھچھوندر نکلی۔ آج کی بیوی۔۔۔ جانے کیا ڈر بیٹھ گیا ہے اس کے دل میں کہ وہ دنیا کی ہر بگڑی بات کے لیے خود کو دوشی سمجھنے لگی ہے، ورنہ ہر بات میں وہ یوں مداخلت پر اتر آئے؟ اور اب جب کہ عاجز آ کر میں نے اس سے کنارہ کشی کر لی ہے، تو وہ گاؤں میں بیٹھ کر اپنی یا میری جان کو رو رہی ہے۔ کیوں نہ روئے؟ ہم مرد بھی تو ہر بار کسی 'تازہ عورت' کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔ تازہ، جیسے وہ عورت نہیں، بھنڈی ہے۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ شاید اس لیے کہ بچپن سے ہی ہم نے تجرّد پہ لکچر سُنے ہیں اور جب شادی ہوئی تو بیوی کے ساتھ پیار کرنے پر کانپے ہیں۔۔۔ خیر، میں بھی اس تازہ عورت کے ساتھ راس رچا کر اس کے بارے میں اپنے سے سوال کرتا ہوں۔ کیا یہ بیوی کے فرائض انجام دے سکتی ہے؟ تو اندر سے ایک مسکت جواب آتا ہے۔ نہیں۔ تو پھر؟ اگر میری بیوی کو اتنا ہی دُکھ ہے تو وہ مجھے لکھتی کیوں نہیں؟ شاید وہ دنیا کی ہر بیوی کی طرح سمجھتی ہے کہ ایک دن میں جھک مار کے آؤں گا اور اس کے پاؤں پڑ کر اسے منا کے لے جاؤں گا۔ عجیب

بھونڈا اعتماد ہے اسے میری محبت پہ۔۔۔ جیسے اس دنیا میں نہ کوئی کلب ہے نہ سینما، تماشا، نہ ہوٹل، نہ قحبہ خانہ۔ نہیں، شاید مجھ سے خلاصی پا کر وہ خوش ہو، ہنستی ہو۔ ہو سکتا ہے میں نے اُسے نہیں، اُسی نے مجھے چھوڑ دیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا رونا دھونا میرا وہم ہو اور یا پھر خواہش ہو میری ہی۔۔۔

ارے کہیں میں خود تو نہیں رو رہا؟ یہ جنہیں میں سانس سمجھ رہا ہوں، کہیں میری اپنی ہی سسکیاں تو نہیں؟ شاید۔۔۔ کیا بے ہودگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے میں خبط الحواسی کا مریض ہو گیا ہوں۔۔۔

عجیب جذبے ہیں، عجیب خواہشیں اور ان سے زیادہ عجیب ڈر۔ مثلاً کل ہی شام میں نے چند البیلوں کے ساتھ کوکاوا چینی ریستوران میں کھانا کھایا۔ ہم اپنے سیٹلمنٹ آفس کے کچھ دوست، پرتگیز چرچ کے سائے تلے، ایک موٹی گوانی عورت کے گھر میں ملے، جو چوری کی شراب بیچتی تھی۔ اس نے ہمیں بڑی تیز مسیرا پلائی اور میرے دوست نند لال کے ہاتھ کچھ اسمگل کی ہوئی گھڑیاں بیچ دیں۔ میں نے صرف ایک سگریٹ لائٹر خریدا۔ وہ تو نند لال کو ایسا سونا بھی بیچ دیتی، مگر اس غریب کے پاس صرف پانچ سو روپے تھے جو آج دفتر میں ایک

ریفیوجی بڑھیا کا کیس ''ٹھیک'' کرنے کے سلسلے میں اس نے اینٹھے تھے۔ بہر حال مسیر اسے دھت ہو کر ہم نے اپنے ایک گجراتی دوست سے کار مانگی، جو اس نے کسی سفارت خانے کی معرفت امپورٹ کی تھی۔ اگر وہ کسی کے نام پر گاڑی خرید سکتا تھا، تو کیا ہم اس کے نام پہ اسے چلا بھی نہ سکتے تھے؟ چنانچہ ہم سب بے کار دوست اس گجراتی کی کالی چمکیلی گاڑی میں بیٹھ کر چلے۔ راستے بھر ہمیں ایک پل کے لیے بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ گاڑی ہماری اپنی نہیں ہے۔ کوکاوا پہنچے تو اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بیرے نے مجھے سلام کیا، جس سے ایک عجیب سی گدگدی میرے اندر پیدا ہوئی کیوں کہ میں سلام لینے کا نہیں، دینے کا عادی تھا۔ کھانے میں ہم نے شارک فِن ملے ہوئے کیکڑے کا سوپ پیا، جس سے مردمی بڑھتی ہے۔ پھر بھُنے ہوئے چاولوں کے ساتھ ہم نے کھٹی میٹھی جھینگا مچھلی کھائی اور دوسرا بہت کچھ الّم غلّم۔ اس پہ نند لال نے نوڈل کا آرڈر دے دیا۔ ہم سب کا پیٹ پھٹ رہا تھا، اس پہ بھی اس نے نوڈل کیوں منگوا لیے؟ اب ہمارے سامنے وہ نوڈل، بے شمار کینچوؤں کی طرح پڑے تھے اور ہم انہیں کھا نہ سکتے تھے۔ لیکن نند لال کو ایک عجیب طرح کی تسلّی تھی۔ یہ گھر پہنچ کر ہماری سمجھ میں آیا کہ ہم نے

اس قدر پیٹ کیوں ٹھونسا؟ اتنا جھوٹا کیوں چھوڑا؟ بات یہ تھی، صبح میں نے، نند لال نے اور دوسرے میرے سب دوستوں نے بہار میں اور یوپی کے کچھ ضلعوں میں سوکھے کی خبریں پڑھیں تھیں اور وہ تصویر بھی دیکھی تھی، جس میں ایک ڈھانچہ سا لڑکا کھڑا کسی پیڑ کی چھال کھا رہا تھا۔ اسی بھوک کے خیال نے شاید ہمارے دماغ میں کوئی اونٹ کا سا کوہان پیدا کر دیا، جسے ہم نے ہفتوں کے کھانے سے بھر لیا۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں خفتی جانے سے دو دن پہلے مجھ سے لڑی تھی۔ ہمارا جس بات پہ جھگڑا ہوا، وہ ایک نہایت فضول سی چیز تھی مٹّی کا تیل، جو گھر میں چولھا جلانے یا خودکُشی کے کام آتا ہے۔ خفتی بکے جا رہی تھی۔ تیل کی ایک بوند نہیں ہے۔ پھر مجھے مت کہنا کھانا نہیں پکایا۔ میں نے کہا، میں نہیں کہوں گا۔ بھوکا مروں گا پر تمہیں نہیں کہوں گا۔ مجھ سے تیل کے کیو میں کھڑا نہیں ہوا جاتا۔

میں دراصل عورت کے اس جذبے سے فائدہ اُٹھا رہا تھا، جس سے وہ مرد کو کبھی بھوکا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ لڑے گی، جھگڑے گی، گالیاں دے گی لیکن پھر کیسے بھی کہیں سے بھی بندوبست کر کے آپ کا پیٹ بھرے گی۔ پھر گالیاں دے گی، پھر

وہی کرے گی۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ مرد جب بچّہ ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی چھاتی سے دودھ پلاتی ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو اس کے لیے روٹیاں پکاتی ہے۔ اس کی ہر بھوک کا سامان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی کے گھر میں جائیں تو یہ عورت ہی ہے جو سب سے پہلے پوچھے گی۔ آپ کیا کھائیں گے؟ کیا پئیں گے؟ بعض وقت تو پوچھے گی بھی نہیں اور گھر میں جو سب سے اچھی چیز بنی ہے آپ کے سامنے رکھے گی۔ آپ یہ مت سمجھیے کہ وہ آپ پر کوئی احسان کر رہی ہے۔ کھا کر اپنی بھوک مٹا کر اُلٹا آپ اس پہ احسان کر رہے ہیں۔

چنانچہ اس دن میں مٹّی کا تیل نہیں لایا، لیکن گھر لوٹا تو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ صبح جب میں دفتر جانے کے لیے نکلا تو میرے ہاتھ میں اخبار تھا، جسے میں آج کل کے حالات جاننے کے لیے کم اور اجابت کے لیے زیادہ استعمال کرتا ہوں۔ ہاں، اخبار ساتھ لیے جائے بغیر مجھے ٹھیک سے باتھ روم نہیں ہوتا نا۔ اس دن کے اخبار میں سیاسی خبروں کے ساتھ معمول کے قتل، دھوکہ دہی، اور ریل کے ایکسیڈنٹ وغیرہ کی خبریں چھپی تھیں۔ ریل کے ایکسیڈنٹ تو خیر ریل کام گاروں، سیاسی پارٹیوں کے ڈسپلن کی وجہ سے روز ہوتے ہیں، مگر ایک بات جو

مجھے خدائی قہر سے بھی زیادہ لگی، وہ بمبئی میں پانی کا قحط تھی۔

پانی کا قحط؟ جی ہاں، یہ بیسیوں صدی کے ہندوستان کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے، ورنہ ہم نے اپنی تاریخ میں ابھی غلّے کے قحط تک ہی ترقّی کی تھی۔ بمبئی کے چاروں طرف سمندر ہی سمندر اور یہاں پانی کا کال، ہمیں فیتا غورث کے اس آدمی کو یاد دلاتا تھا جو نچلے ہونٹ تک پانی میں ڈوبا ہوا ہے لیکن جب پینے کے لیے اپنا منہ نیچے کرتا ہے تو ساتھ ہی پانی کی سطح بھی نیچی ہو جاتی ہے اور وہ پانی میں پیاسا مر جاتا ہے۔ ایک ہی دن پہلے میں نے کیو میں کھڑے ہونے اور مٹّی کا تیل لانے سے انکار کیا تھا۔ لیکن اب جب کہ میں نے خفتی کو بتایا کہ کچھ دیش بھگت بمبئی سے اُتری لوگوں کو پانی نہ ہونے کی وجہ سے نکال رہے ہیں تو وہ مجھ پر برس پڑی، جیسے میرا قصور تھا اس میں۔۔۔ پھر وہ اپنے آپ خود گالیاں دینے لگی، جیسے میں نے اس پہ کوئی بہت بڑا الزام لگا دیا۔ اس میں الزام کی کیا بات تھی؟ زندگی خود ایک الزام ہے بھائی، ایک بہت بڑی تہمت جو مرد پہ کم اور عورت پہ کچھ زیادہ ہی لگائی گئی ہے۔ پھر اتنے بڑے ملک، اس کے اتنے بڑے کلچر، فلسفے، پرانی تاریخ کے وارث ہونا ہے تو یہ قیمت تو دینا ہی پڑے گی۔ نہیں دینا تو جایئے امریکہ، جہاں کی

اصلی تاریخ ہی تین سو سال پُرانی ہے۔ کیسے وہ پاگل کی طرح سے دوڑے ہیں، مادّی ترقی کی پریڈ گراؤنڈ پہ۔ آخر روحانی ترقی بھی تو کوئی چیز ہے۔۔۔

ہم جائیں گے تو کہاں جائیں گے؟ خفتی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ اُنیس برس ہوئے ہم کو خوشاب، پنجاب سے نکلے، اپنے پتروں کی مرجادا، ان کی سمپتی چھوڑ کر، راستے میں مرے کٹے، کنوئیں ہماری لاشوں سے پٹے، پر چلتے رہے۔ نجر ایک ہی طرف تھی کہ بھارت کی شش شاملا، اس کی ہری بھری گود میں جائیں گے تو سب دکھ دلدّر دور ہو جائیں گے۔ یہاں آئے تو صرف جوتے کھائے، بھگوڑے کہلائے، کچھ کھانے کو نہیں، ہر چیز کو آگ لگی ہے۔ آج ایک چیز کے دام پندرہ پیسے ہیں، تو دس ہی دن میں پچاس پیسے ہو جاتے ہیں۔ چادر چھوٹی، مانُس لمبا، آدھا ڈھانپنے پہ بھی پورا ننگا۔ تم ہی مجھے یہاں لے آئے۔ بمبئ میں بِجنس بہت ہے، اب کرو بِجنس۔ میں تو ہوں ہی بھاگوں جلی، جو ایک تمہارے ساتھ چلی، دوجے اس سروپ نکھا کے دیس میں باسا کیا۔ اپنی ناک تو کٹے ہی کٹے۔ ہم نے یہاں اتنا پیسہ لگایا، کھون پسینہ بہایا اور کھاری کی سی کھادر، کھاری جمین کو لاہور کی انار کلی بنا دیا اور اب اِدھر کے گھاٹی لوگ بولتے ہیں۔ مو مبئ کُنئے چی؟ ہم چی۔۔۔ تم

پنجابی، سندھی لوگ جاؤ۔ اب ہم کدھر جائیں؟ بولو؟ اپنا بھارت دیس کدھر ہے، بولو جی۔۔۔؟

میں کیا بولتا؟ بنگال ہے تو بنگالیوں کا۔ گجرات گجراتیوں کا، دکھن دکھنیوں کا، ہمارا تو کچھ بھی نہیں۔ ہم تو تیرتی ہوئی آبادی کہلانے لگے، کچھ دیر بعد اُڑتی ہوئی کہلائیں گے۔ میں اخبار ہاتھ میں لیے دفتر جانے کے لیے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں، باہر چالی کے میدان میں نل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مٹی میں ملا ہوا ایک قطرہ ٹپکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہیں مٹّی کا تیل ہی نہ ہو۔ لیکن نہیں وہ پانی ہے۔ نل اپنی سانس روک کر سوں سوں کرنے لگتا ہے۔ اس کے نیچے لوٹس گھی کا ایک خالی ٹین رکھا ہے اور اس کے بعد لائن میں کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ مٹکے، بالٹیاں، ٹھلیاں پڑی ہیں، اور کچھ نہیں تو پتھر ہی پڑے ہیں جو کسی کی باری کی نشانی ہیں۔ ان کے مالک یا مالکنیں آئیں گی تو برتن کے آگے پیچھے ہو جانے سے ایک دوسرے کے بال نوچیں گی۔ لڑتی ہوئی چھچھوندریں معلوم ہوں گی۔۔۔ خقتیاں سب کی سب۔۔۔

اس سنسار کا سارا سوندریہ انسان کے کارن ہے اور جب انسان نہ ہو تو اس کی

چیزیں کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہیں۔ آپ نے کسی مرنے والے کی پشواز دیکھی ہے؟ میں نے دیکھی ہے۔ یہ ہندو مسلم فسادات کے بعد کی بات ہے۔ میں ان دنوں جمّوں میں تھا اور ایسے ہی چلتے ہوئے توی دریا کے کنارے جا نکلا۔ وہاں بریتے میں ایک ڈھانچ پڑا تھا، جس کا کچھ حصّہ تو ریت میں تھا اور کچھ باہر۔ ڈھانچ دیکھنے سے کیا پتہ چلتا ہے کہ وہ مرد کا ہے یا عورت کا۔ ایک عام آدمی کو پیلوس (Pelvis) دیکھنے سے اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن صاحب، اس ڈھانچ کی ٹانگوں کے ساتھ پشواز کے چیتھڑے چپکے ہوئے تھے اور ایک بازو کی ہڈّی پہ چوڑیاں تھیں، جو آب و ہوا اور باد و باراں سے کالی پڑ چکی تھیں۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔۔۔ جیسا کہ میں حقیقت کو دیکھ کر ہمیشہ کرتا ہوں۔ لیکن بھارت دیس ہی اتنا بڑا ہے کہ جہاں سے بھاگیں وہ بھارت، اور جہاں پہنچیں وہ بھی بھارت، اور پھر بھارت کہیں بھی نہیں۔۔۔ ہاں، تو میں ان برتنوں کی بات کر رہا تھا۔۔۔ وہ برتن موجود اور برتن والیاں غائب! نل میں پانی شاید دو بجے چھوٹتا تھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب منظر انگڑائی لے کر جاگے گا اور بھرپور ہو جائے گا۔ جھگڑے ہوں گے، مار پٹائی ہو گی اور پھر جا کے کہیں خون پانی ہو گا۔ جو بھی ہو گا، اچھا ہی ہو گا

کیوں کہ اس مردہ ہول سے وہ زندہ ہول اچھا۔۔۔وہ خالی برتن جن کے منہ کھلے تھے اور کنارے تڑُے مڑُے، ٹوٹے ہوئے، جیسے محبت کے پے در پے ضربوں سے کسی چھنال کے ہونٹ۔۔۔میں اخبار ہاتھ میں لیے وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

بس کا کیو خاصا لمبا تھا اور دفتر سے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ اس پر بھی کیو میں لگے بغیر چارہ نہ تھا۔ ڈر کے کارن وہ کیو مجھے ایک بہت بڑا اژدہا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں، ڈر اور امّید۔ اندھیرا اور روشنی۔ اس لیے ڈر کی صورت ہمارے مذہبی پیشواؤں نے اژدھے کی بنائی ہے، جو منہ پھاڑے، دانت نکالے، اپنے چار پاؤں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہم پہ رینگ آتا ہے۔ کیوں کہ ہم گناہ گار ہیں۔ زندگی کے گناہ سے آلودہ۔ اگر ہم اژدھے کے کھُلے ہوئے منہ، اس کے بڑے بڑے دانتوں اور آگ برساتی ہوئی آنکھوں سے بچ بھی جائیں، تو اس کی دُم کی مار سے کہاں بچ سکتے ہیں، جو کوریا سے لے کر چین، جاپان اور بیچ میں ہندوستان سے لے کر لنکا تک پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن یہ کیو ایک عجیب اجگر تھا جو سرکتا ہی نہ تھا اور ہم جہاں کے تہاں کھڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا حالات کی جادوگرنی نے انسان کو مکھّی بنایا اور دیوار پہ لگا یا۔ پھر کیو تھوڑا سا ہلا، جیسے مرے ہوئے سانپ کی دُم بھی ایکا ایکی کسی

بدنی اضطرار سے اپنے آپ ہل جاتی ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ ساکت ہو گیا، کیوں کہ بس نہیں آئی تھی۔ ایسے میں اخبار کا وہ حصّہ بہت کام آتا ہے جس میں کوئی سکینڈل چھپی ہوتی ہے، اور ایک ادیب کی تحریر کے ساتھ تقریباً ننگی لڑکی کی تصویر۔ میں اس ننگی لڑکی میں اتنا غرق ہو گیا کہ کوئی ہوش ہی نہ رہا، جبھی سامنے سے آواز آئی۔

"ٹین کہاں ہے؟"

"ایں۔۔۔؟" میں نے اخبار سے سر اٹھایا۔ "ٹین؟"

"ہاں ہاں۔۔۔ ٹین، کنستر، کنستر۔"

جبھی مجھے پتہ چلا کہ میں مٹّی کے تیل والے کیو میں لگ گیا ہوں۔ شاید خفتی کی بات میرے دماغ کے کسی کونے میں رہ گئی، جیسے کوئی مصرعہ شاعر کے دماغ میں رہ جاتا ہے۔ جبھی میرے ساتھ والے نے نہ معلوم مجھ سے کیوں پوچھا۔ "آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی ہاں، جی نہیں۔۔۔" میں نے جواب دیا۔ "میں صرف شدہ ہوں۔" اور پھر

دکان دار سے کچھ ایسی ہی مہمل بکتے ہوئے میں وہاں سے بھاگا اور بس کے کیو میں جا لگا جو تیل کی دکان کے برابر ہی تھا۔

دفتر سے اور بھی دیر ہو جانے کی وجہ سے اب مجھ سے اخبار بھی نہ اٹھایا جا رہا تھا۔ میں نے ایک نظر پھر اس کے آخری صفحے پر ڈالنے کی کوشش کی۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا، انہی چند لمحوں کے بیچ کسی نے اس ننگی لڑکی کو کپڑے پہنا دیے ہیں اور تصویر کے ساتھ چھپی ہوئی ادبی تحریر فحش معلوم ہو رہی ہے۔

میری حیرانی، میری پریشانی تو تھمتی ہی نہیں۔ دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کہا بھی تو صرف اتنا سا "گجن سنگھ، آج تم پھر لیٹ آئے؟"

"ایسے ہی، اسرانی صاحب۔۔۔" میں نے لنگ سی عذر داری کرتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے آج میں غلطی سے غلط کیو میں لگ گیا۔ ہی! اور ساتھ ہی میں دل میں سوچ رہا تھا کہ دوبار نفی کا استعمال مثبت ہو جاتا ہے۔

"ہو جاتا ہے" اسرانی نے کہا "کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

”کیا ایسا ہو جاتا ہے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہی۔۔۔ زندگی میں آدمی کبھی غلط کیو میں بھی لگ جاتا ہے“ اور پھر اسرانی نے اپنے آپ کو کسی فائل میں ڈبو دیا۔ اور میں اپنے ٹیبل پر لوٹ آیا۔ کسی بیوہ کا کیس تھا جسے ڈھونڈنے کے لیے میں نے پُرانے ریکارڈوں کی سب خاک اپنے سر پر ڈال لی تھی۔ بات یہ تھی کہ لنک فائلیں نہیں مل رہی تھیں۔ بیوہ کے کئی دیور جیٹھ تھے جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک لینس ڈون کی چھاؤنی میں ٹھیکے دار تھا۔ دوسرا کٹک میں کہیں سر پٹک رہا تھا اور ایک تو ہانڈی میں تھا۔ پھر ایسے ہی کئی بہنیں تھیں، جن میں سے ایک نے تیسرا شوہر کر لیا تھا اور تینوں میں سے دو دو، تین تین بچّے تھے۔ شاید چار بھی ہوں۔

مجھے اپنا آپ ایک ہاتھی لگا، جو پہلے تو سونڈ سے سب مٹّی، سب کوڑا کرکٹ اپنے بدن پر پھینک لیتا ہے اور ارنف ارنف کرتا ہوا پانی میں چلا جاتا ہے اور پھر ویسے ہی سونڈ کی مدد سے پانی کے فوّارے کو اپنے بدن پہ چھوڑنے لگتا ہے۔ بیوہ کی مدد تو میرے لیے گنگا اشنان سے بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ میں نے سب لنک فائلیں جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ نکالیں۔ کیس کے باقی کو بڑ سیدھے کیے اور اس کا کلیم

خود جا کر کمشنر صاحب سے پاس کروا دیا۔ لیکن وہ بیوہ صرف میرا شکریہ ادا کر کے چلتی بنی۔ بیوہ جو مجھے ایکسائیٹ کرتی ہے، جاتے ہوئے اس نے ایک مسکراہٹ بھی تو میرے پلّے نہ ڈالی۔ شاید وہ مسکرا ہی نہ سکتی تھی، کیوں کہ اس کے ہونٹوں کے اِرد گرد کی رگیں اور پٹھے ایک مسلسل مصیبت میں جامد ہو چکے تھے اور ہر راہ رِو محبت نے اس کے لیے محبّت کے سے حسین و جمیل جذبے کو ایک بے معنی سی گردان بنا دیا تھا۔۔۔

جبھی مجھے سپرنٹنڈنٹ اسرانی کی ہمدردی سمجھ میں آئی۔ اس نے ریز، میری بجائے نند لال کو دے دیا تھا جو بہت چالو آدمی تھا۔ نند لال اوپر سے جو کچھ کماتا تھا اس میں اسرانی کی بھی پتی تھی۔ میرا لیٹ آنا تو ایک بہانہ تھا۔ پھر نند لال نے اسرانی سے خاندانی تعلّق پیدا کر رکھا تھا اور مہینے میں دو تین بار وہ اپنی بیوی کے ساتھ اسرانی کے کنوارے کوارٹرز میں جاتا تھا۔

سیٹلمنٹ آفس اچھا خاصا کبوتر خانہ تھا۔ اس میں زیادہ تر تو سندھی اور پنجابی ہی کام کرتے تھے، لیکن اب کچھ مدراسیوں نے آنا شروع کر دیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ایک بار دفتر میں مدراسی آ جائیں تو پھر پورا دفتر مدراسیوں سے بھر جاتا ہے۔

مگر یہ تو بنگالیوں کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے اور مراٹھیوں کے بارے میں بھی۔ اس سلسلے میں پنجابی بہت اچھا ہے۔ وہ ایک بار کسی دفتر میں آجائے تو مجال ہے جو کسی اور پنجابی کو پاس بھی پھٹکنے دے، چاہے وہ کتنا ہی قابل ہو۔۔۔ دفتر میں آزادانہ ایک دوسرے کی ماں بہن ہوتی تھی اور ہر قومیت، قوم بننے کے کرب میں مبتلا تھی۔

وہ دن بہت گندہ تھا یا شاید مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اسرانی نے میری ترقی کے سب راستے روک دیے تھے اور میری بیوی بدصورت اور بوڑھی ہوگئی تھی اور مجھے مسکراہٹوں کو سِکّے میں ڈھالنے کا فن نہ آتا تھا۔ دفتر میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ہندو مسلم فسادات سے کہیں زیادہ تھا۔ قتل سے زیادہ تھا اور خون سے بھی زیادہ۔ بعض وقت تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کسی چیز، کسی جذبے کی ضرورت سے زیادہ نفی کرنا ہی اُسے قبول کرنا ہے۔ ہندو جتنا زیادہ اس دنیا کو مایا سمجھتا ہے، اتنا ہی وہ پیسے کا پجاری ہے۔ ہندوستان میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس نے دولت کو ایک دیوی، لکشمی دیوی نہ بنا دیا ہو اور ایک گندے اور بھونڈے طریقے سے اس کی پوجا نہ کی ہو۔ وہ پوجا میں اس کی پوجا کرتا ہے۔ دیوالی میں پوجا۔ دسہرے میں

اپنی کار پہ صد برگ کے ہار ڈالتا ہے، جو دنیا کا کوئی بشر نہیں ڈالتا۔ کیسے مورتی پوجا اور پیسے کی پوجا آپس میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ بہر حال اپنے دیس میں ایک نیا ضمیر جاگا ہے، ایک نئے انتا کرن نے انگڑائی لی ہے۔

اور پیسہ ہے کہ دن بدن میلا ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی جو نیا چھپا ہوا نوٹ ہاتھ آتا ہے تو اپنا کتنا سُتھرا اور کتنا صاف معلوم ہوتا ہے۔ یا شاید میرا اپنا من گندہ ہے۔ جب بھی میرے ہاتھ میں میلا اور چُرمُر سا نوٹ آتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، اسے دق کے مریض نے چھُوا ہے، یہ رنڈی کے کوٹھے سے آیا ہے۔ لیکن جب حوصلہ کر کے اُسے ہاتھ میں لیتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے، میرے ہاتھ میں روپیہ نہیں، چھ آٹھ آنے ہیں جنہیں میں چار آنے میں نکال دینا چاہتا ہوں۔

وہ تنخواہ کا دن تھا اور مجھے "ریز" کی امید تھی۔ امید کیا، میری باری تھی۔ لیکن۔۔۔ میں پیسے ہاتھ میں لیے ہوئے نکلا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں عورت ہوں اور ابھی ابھی میری آبرو ریزی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی مرضی، اپنی خوشی اور محبّت سے اپنے بدن کو پیار کرنے والے کے حوالے نہیں کیا۔ بلکہ کسی نے زبردستی میری عزّت لوٹی ہے۔ بدن کی بات چھوڑیے، روح کے تکبّر کا کیا ہوا۔

شاعر کے لفظوں میں ہم تو "کوچہ و بازار کا مال" ہو گئے۔ جو بھی نگاہ ہم پہ اُٹھتی ہے، خریدار کی طرح سے اُٹھتی ہے۔۔۔ رونا دل سے اُٹھتا ہے، مگر آنسو کہیں گلے میں پھنس کے رہ جاتے ہیں۔ اِرد گرد کے سب لوگ رنڈیاں ہیں، جو اپنے اپنے دھندے کے سلسلے میں گاہکوں کو پھنسا رہے ہیں۔ آنکھ مار رہے ہیں اور بیچ بیچ میں اپنے بدن کے وہ حصّے دکھاتے ہیں جن سے مرد کے دماغ میں ایک محشر برپا ہو جاتا ہے۔

دفتر سے لوٹنے پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بازار۔۔۔ 'پکاسو' نے بنایا ہے۔ آرٹ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنا بڑا آرٹ ہے اس میں۔ ہوٹل میں اسٹیشنری دکھائی دے رہی ہے اور کہیں فولاد کی لیتھ پر کوئی حسینہ الارپو ناچ رہی ہے۔ پرائمری رنگوں میں وصال کسی ربط سے نہیں۔ وہ دھبّے سے ہیں، ایسے ہی ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ اگر آپ نے نیل کو نارنجی میں حل ہوتے نہیں دیکھا تو چلیے میں دکھاتا ہوں۔ غالباً آپ نے بمبئی میں سمندر کے بیچ حاجی علی حسین مسجد پہ شالیمار بسکٹوں کا بڑا سانیون سائن نہیں دیکھا جس نے خدا کو بسکٹ بنا دیا۔ وکٹوریہ والے کی وہ گالی نہیں سُنی جو ٹھمری کے ریکارڈ، 'جمنا کے تیر' پہ سُپر امپوز ہو رہی ہے۔

میری قمیص پہ یہ گل کاری کسی حسینہ کی کشیدہ کاری نہیں، پان کی پیک ہے جو کسی نے چلتی بس پر سے مجھ پر پھینکی ہے۔ سڑک پہ کیلے کے چھلکے اور ردّی کاغذ دیوالیے کی دستاویزیں بنے اُڑتے پھر رہے ہیں اور یہ کتاب جو آپ میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہیں، گرما گرم نسخہ ہے جو سڑک کے کنارے والی اسٹال کا مالک میرے ہاتھ میں تھما گیا ہے۔ اسے پڑھیے اور پھر آ جایئے ٹیگور، ٹالسٹائی اور چیخوف۔۔۔

اپنے جسمانی اور ذہنی افلاس کی وجہ سے میں بہت سی اِدھر اُدھر کی چیزیں خریدتا ہوں۔ میں پیسہ رکھ ہی نہیں سکتا نا۔ پیسہ وہی رکھتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو۔ اب میں لٹل ہٹ میں جاؤں گا اور ریتا کا ناچ دیکھوں گا، جو اپنے بدن پہ انجیر کا پتہ، صرف انجیر کا پتہ لٹکائے پھرتی ہے، ایک گلابی تاگے سے جو بدن کا ہم رنگ ہونے کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں، نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ خفتی ناراض ہو گی۔ جب مجھے کیا پتہ تھا، وہ پھر بھی ناراض ہو جائے گی اور پورے دیس کا الزام خود پہ لیتی ہوئی گاؤں جا کر اپنے بھائی کے پاس بیٹھ جائے گی اور پھر کبھی نہیں آئے گی اور میں اپنی خفّت کو چھپانے کے لیے سب سے کہتا پھروں گا۔ میں نے خفتی کو

نکال دیا۔ بہت بک بک کرنے لگی تھی وہ۔۔۔

میں گھر تک پیدل جانے کی سوچتا ہوں۔ ایسے ہی اپنے آپ کو اذیّت دینے کے لیے، جیسے یوگی اپنے چاروں طرف آگ جلا کر بیچ میں تپ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ یا اپنے آپ کو زندہ در گور کر لیتا ہے۔ خود کو اذیّت دینے سے کون سا کام ہے جو ہمارے ملک میں نہیں ہو سکتا۔ آپ آج سے کھانا چھوڑ دیجیے، دیکھیے کیسے گئو ہتیا بند نہیں ہوتی؟ ایک صوبے کے دو یا دو کا ایک نہیں بن جاتا؟ سرکش طالب علم بکری بن کر اپنے کلاس روم میں نہیں لوٹ جاتے؟ چنانچہ اسی تپسیّا کے عمل میں اپنے وجود سے نکلنے والی برقیات کی مدد سے بھارت کا بھوشیہ سنوارتے ہوئے میں چلتا گیا۔ جبھی گرے رنگ کی مرسیڈیز کار کا مجھے دھکّا لگا اور میں بجلی کے ایک کھمبے سے جا ٹکرایا۔ اب برقی روئیں میرے بدن سے نکلنے کے بجائے اُلٹا میرے بدن میں آرہی تھیں۔ ہندوستان کا مستقبل ستیاناس ہو رہا تھا۔ میں فٹ پاتھ پہ جا گرا تھا جو کہ میری اصلی جگہ تھی۔ خون نکلا تھا مگر تھوڑا سا۔ وہ زیادہ نکلنا چاہیے تھا۔ فسد کچھ اور بھی کھلنا چاہیے تھی۔ ہاں میری اذیت پسندی یہی چاہ رہی تھی اور اسی میں ملک اور قوم کا بھلا تھا۔ اس لیے میں تو نہ چاہتا تھا کہ کار کے مالک کو کچھ

بھی کہا جائے، لیکن لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور مارنے لگے۔ اب جو بھی آتا تھا اسے ایک لگا کر چل دیتا تھا۔ یہ کوئی نہ پوچھ رہا تھا، قصور کس کا ہے؟ حالانکہ قصور میرا تھا۔ سراسر میرا، جس نے اپنی اصلی جگہ چھوڑ کر سڑک پر چلنا شروع کر دیا تھا، لیکن لوگ۔۔۔ جانے کہاں کی مار کہاں نکال رہے تھے۔ وہ اندر سے کتنے ممنون نظر آرہے تھے کہ میں نے انہیں ایک موقع دیا۔ وہی نہیں، ایک طرف سے کوئی ٹوٹا پھوٹا بوڑھا پارسی چلا آیا جس کے بدن میں رعشہ تھا۔ اُس نے بھی ایک ہاتھ سے اپنا دوسرا ہاتھ پکڑا اور اس غریب امیر کے جڑ دیا۔ وہ مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ہت، تھے آئیں شوں کریو؟۔۔۔ ہت تھے آئیں شوں کریو؟۔۔۔ جانے یہ کیسی نامردی تھی جس کا وہ بدلہ لے رہا تھا۔

جبھی میری نظر کار کے مالک پہ پڑی اور اپنے ماتھے سے خون پونچھتے ہوئے میں لپک کر کھڑا ہو گیا اور چلّانے لگا۔۔۔ ’’چھوڑ دو، چھوڑ دو اسے۔‘‘

اب اس کے خون بہہ رہا تھا۔ غالباً اتنا ہی جتنا میرے بہا۔ بے شک کوئی تول کے دیکھ لیتا۔ سر پر سے خون بہنے سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں، جنہیں پونچھتے، کھوستے ہوئے اس نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”شانتی۔۔۔“میں نے پکارا۔

شانتی لال نے کانپتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا، ”گجن! مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ اور پھر دہشت کے عالم میں وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

لوگ حیران ہو رہے تھے اور جو حیران نہیں تھے، مجھے ماں بہن کی گالیاں دینے لگے۔۔۔

”تم کہاں، شانتی۔۔۔۔۔۔یہ کار؟“

”ہاں یار۔۔۔“وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔

”یہ کس کی کار ہے؟“

”میری!“

”تم۔۔۔؟“

میں سوچ رہا تھا یہ آدمی، جس نے میرے ساتھ فاقے کیے ہیں اور رے روڈ کے ایک گندے سے ہوٹل میں میرے ساتھ رہا ہے، کار کا مالک کیسے ہو گیا؟ لیکن

جلد ہی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ مرکز میں کسی ڈپٹی منسٹر کا بھانجا تھا۔

شانتی نے بہت منّت کی کہ میں اس کی کار میں چلا آؤں، لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ۔۔۔ یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ شاید شانتی ڈر رہا تھا کہ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا۔ لیکن میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس نے جیب سے دس روپے نکال کر دو کانسٹیبلوں کو دے دیے اور مجھے ٹاٹا کہہ کر چل دیا۔ قاعدے سے مجھے چاہیے تھا وہاں جاتا اور اینٹی ٹیٹانس انجکشن لیتا، لیکن میں تو چاہتا تھا مجھے ٹیٹانس ہو جائے۔ خود کو بچانے کا جو فطری جذبہ انسان میں ہوتا ہے، میں اور میری قبیل کے ہندوستانی اس سے بہت آگے نکل چکے تھے۔

سڑک پہ چوہے جا رہے تھے اور چھچھوندریں۔ کسی چوہے نے سوٹ پہن رکھا تھا اور چھچھوندر کاشٹا لگائے گھوم رہی تھی۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر رونق نہ تھی۔ کہیں خون کے آثار نہ تھے۔۔۔ اور میں سوچ رہا تھا، جب بمبئ میں پانی ختم ہو جائے گا تو یہ سب کیسے بھاگیں گے، ایک دوسرے پہ گرتے پڑتے، نوچتے، کاٹتے۔۔۔ چوہے!

جبھی میں پریل کے علاقے میں جا پہنچا۔

بیس پچیس آدمی سر گرائے ہوئے جا رہے تھے، ایک سُست سی رفتار سے۔ ان کے چہروں پر ماتم تھا۔ ضرور ان غریبوں کا کوئی مر گیا تھا اور یہ اس ماتمی جلوس کا حصّہ تھے۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو مجھے کوئی ارتھی، کوئی جنازہ دکھائی نہ دیا۔ تھوڑا آگے، اُن سے کچھ ہی فاصلے پر تیس پینتیس آدمی اور بھی دکھائی دیے، جو ویسے ہی سر جھکائے ہوئے جا رہے تھے۔ ضرور وہ اِن پہلے آدمیوں کا حصّہ ہوں گے۔ ضرور اِن کا کوئی بہت ہی محبوب، بہت ہی چہیتا مر گیا ہو گا، ورنہ سوائے لیڈر کے ایک عام آدمی کے جنازے کے ساتھ بمبئی میں اتنے لوگ کہاں جمع ہوتے ہیں؟

میں نے گھوم کر دیکھا، لیکن مجھے پھر کوئی جنازہ دکھائی نہ دیا۔

ہمّت کر کے میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا۔ ''آپ لوگ۔۔۔ جنازہ کہاں ہے؟''

''جناجا؟'' اُس نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں ہاں۔ جنازہ، ارتھی!۔۔۔ کوئی مر گیا ہے نا؟''

"نہیں۔۔۔" اس نے ہر قسم کے جذبے سے عاری، بے رنگ سا چہرہ اوپر اُٹھاتے، میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ مجور ہو تا۔۔۔ مل سے آیانا، کیا؟"

میں اسی طرف جارہا تھا، لیکن معلوم ہوتا تھا انہی لوگوں کے ساتھ جارہا ہوں، جن کا جنازہ بھی غائب ہے۔۔۔

تعطّل

اُس سال میں جس ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا تھا، اُس کا نام سمفنی تھا۔

مجھے ہنسی اس لیے آتی ہے کہ سمفنی انگریزی میں نغمے کو کہتے ہیں اور اِس ہاؤس بوٹ سمفنی میں نغمہ نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی۔ ٹورازم کے محکمے کے حساب سے یہ بوٹ تیسرے درجے کا تھا۔ یہ بات نہیں کہ میں اس سے اوپر کے درجے کا بوٹ کرایے پہ لینے کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ قصّہ صرف یہ تھا کہ اُس سال کشمیر میں ٹورسٹ ہی ٹوٹ کے پڑا تھا اور اچھے درجے کے سب ہاؤس بوٹ پہلے آنے

والوں اور کالے بازاریوں نے لے لیے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا ہوٹل تک، سیر سپاٹے والوں سے پٹا پڑا تھا۔ سمفنی کی دیودار پرانی ہونے کی وجہ سے سڑ گل گئی تھی اور برسات اُس کی دیواروں پر چھاجوں رُو گئی تھی۔ کاریڈور میں چلتے تھے تو پوری ناؤ ایک طرف ڈول ڈول جاتی تھی اور پاؤں کے نیچے تختے ایک عجیب طرح کی چوں چیخ کی آواز پیدا کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کوئی ہنی مون جوڑا ایک دو رات سے اوپر اس میں نہ رہتا تھا۔ پھر غسل خانے میں تو بڑی بڑی دراڑیں تھیں جن کے نیچے سے جھیل کا گدلا پانی انسان کے ننگے پن کا منہ چڑاتا تھا۔

یوں جھیل کا پانی گدلا نہ تھا۔ برسات سے اِدھر تو وہ ہمیشہ گوری کے بدن میں وریدوں کی خُنک سی نیلاہٹ لیے رہتا تھا، لیکن حمدیا۔۔۔ غلام حمدانی، سمفنی کے مالک اور پڑوس کے 'فلائنگ جیک' اور 'پِن اَپ' کے مخدوم، اندر کا کوڑا کرکٹ اور گندگی باہر جھیل ہی میں پھینکتے اور پھر کھانا بنانے کے سلسلے میں وہی پانی استعمال کرنے کے عادی سے ہو گئے تھے۔ ہم ہندوستانی تو خیر لگاتار گندگی میں رہنے کی وجہ سے دافعِ جراثیم ہو گئے ہیں۔ لیکن صرف زکام ہی سے چھُٹّی پا جانے والے مغربی ٹورِسٹ ان جراثیموں کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ 'فلائنگ

جیک' میں رہنے والے سینیئر کارڈیرو نے اپنے بوٹ کے مالک غلام قادِر کے خلاف شکایت کر دی، جس سے اُن بوٹ والوں اور ہانجی لوگوں کی نظر میں مَیں اور بھی بڑا فرشتہ ہو گیا۔

پھر یہ 'سمفنی' فلائنگ جیک' اور 'پِن اَپ' جھیل میں ایسی جگہوں پہ کھم گڑے تھے کہ ایک طرف تو سامنے کی پہاڑی شنکر آچاریہ منظر کی خوبصورتی کو قتل کیے دیتی تھی اور دوسری طرف ڈل جھیل اور جہلم دریا کے بیچ کا لاکِنگ سسٹم جذبوں کے سیلاب کا گلا گھونٹ دیتا تھا۔

البتّہ سمفنی کی چھت سے بائیں طرف دور ہر مکھ سے اُدھر کی پہاڑیوں میں کبھی کوئی سُرخ سفید پنچھی اپنے سُبک سے پروں پر تیرتا ہوا نیچے کی زمرّدیں رِداؤں میں گم ہوتا، تو یوں لگتا، جیسے میری رتنا کے چہرے پر کوئی شرارت کا خیال آیا اور نکل گیا۔

یہ رتنا کون تھی۔۔۔ کوئی نہیں۔

فلائنگ جیک کا سینیئر کارڈیرو گواٹے مالا سے آیا تھا اور ٹوٹی پھوٹی امریکن

انگریزی جانتا تھا۔ وہ ناٹے قد کا آدمی تھا، جس کا چہرہ کچّے گوشت کی طرح سرخ اور پھولا ہوا تھا، جیسا کہ زیادہ شراب نوشی اور عیّاشی سے ہو جاتا ہے۔ اُس کے پورے سر پر بال نہیں تھے، البتہ ماتھے پر ایک چھوٹا سا گپھّا تھا، جو سینیوٗر ریتا کے ساتھ لڑائی کے بعد اور بھی چھوٹا ہو جاتا تھا۔

سینیوٗر ریتا کارڈیرو ایک دُبلی پتلی عورت تھی، جو ہمیشہ لنگری پہنے فلائنگ جیک میں اِدھر اُدھر جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اکثر دن کے وقت وہ کھڑکی میں اوندھی پڑی جھیل کے پانی میں اپنی انگلیوں کے کیکڑے چلاتی رہتی اور رات کو وہیں پڑی پڑی پانی میں چاند کا عکس دیکھا کرتی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ ہفتے بھر سے زیادہ یہاں نہیں رہیں گے، کیونکہ راتیں دھیرے دھیرے اماوس کی طرف لپک رہی تھیں۔

سینیوٗر کارڈیرو کیوں تیسرے درجے کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا۔۔۔ یہ کوئی بھید بھری بات تھی۔ سامنے بُولے وارڈ پر یونائیٹڈ نیشنز کے کچھ افسر اپنی ٹوپیوں پر ہلکے نیلے رنگ کی پٹّیاں جمائے ہوٹل پیلس اوبرائے کو جاتے اور لوٹتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کبھی ان میں سے کسی کی جیپ بُولے وارڈ پر ہمارے سامنے

کے حصّے پہ رُکتی اور افسر اتر کر کنارے پر سے آواز دیتا۔۔۔ سینیوُر۔۔۔ سینیوُر کارڈیر وووو۔۔۔

آواز گونجتی تو یوں معلوم ہوتا، جیسے کوئی کہے جا رہا ہے۔۔۔ رورورورو۔۔۔

ایک دن ایسی ہی آواز آئی اور میں نے دیکھا سینیوُر یتا پانی سے اپنی انگلیوں کا کیکڑا نکال کر 'فلائنگ جیک' میں اندر کی طرف لپکی۔ لِنگری میں اُس کے جسم کا بھُوتیا ڈھانچہ دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے یوں لگا، جیسے بولے وارڈ پر کھڑے جنرل کو سینیوُر کے جواب کی ضرورت ہی نہیں۔ اُس نے پیٹھ ہماری طرف کر کے شنکر آچاریہ کی پہاڑی کو دیکھا، جہاں کہیں سے آئینے کا عکس کانپ رہا تھا۔ عکس کبھی دھیرے دھیرے ہلتا، کانپتا اور کبھی تیز تیز۔ وہ بجلی کی طرح ایک کھوہ میں گُم ہو گیا، اور پھر لوٹ کر پہاڑی پر پھولوں کو ایک کیاری کو روشن کرنے لگا۔ پوست کے پھولوں کی سرخی اس روشنی میں ایک دم فلوریسینٹ ہو اُٹھی تھی۔

جنرل نے مُڑ کر 'فلائنگ جیک' کی طرف دیکھا، ہاتھ اُٹھا کر ٹوپی چھوئی اور جیسے

سینیوریتا کو سلام کرتا ہو، جیپ میں بیٹھ کر سرحدوں پر لگی 'آگ بجھانے' کے لیے چل دیا اور میں ایک معمولی ہندوستانی کی طرح "اپنا کیا ہے؟" کے جذبے سے سرشار، مڑ کر سمفنی کے اندر گلدان میں پڑے سوکھے سڑے گلیڈی اولا کو نکالنے، پھینکنے اور گنگنانے لگا۔

ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

جب کہ تم بن نہیں کوئی موجود،

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا؟

کیا ہے۔۔۔؟ کیا ہے؟ یہ کیا۔۔۔ کیا ہے؟

شہر میں ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ایک طرف سے مولوی فاروق کے حواری نکل آئے تھے اور دوسری طرف سے مندوبین کی بھاری تعداد، جو کسی کانفرنس کے سلسلے میں ریاست کے دور افتادہ علاقوں، جمّوں کی تحصیل اور کشتواڑ کی طرف سے آئی تھی۔ ان میں ڈوگرے تھے، پھر گوجر، بروالے، استصوابیے۔۔۔

اس جم غفیر میں کالج کے طالب علم، یہاں تک کہ طالبات بھی بُرقعے وُرتے

پھینک کر شامل ہو گئی تھیں۔ جب اتنے سارے لوگ ایک دم لال چوک، ریذیڈنسی روڈ کے نزدیک جمع ہو جائیں، تو تانگے کا دُھر اٹوٹنا بھی جھگڑے کا بہانہ بن سکتا ہے۔ اور لڑکی کی تو بات ہی مت کیجیے جو اپنے وجود ہی سے اتنی خستہ اور بھُر بھُری ہوتی ہے کہ ہاتھ تو ایک طرف، نظر ہی اُسے ریزہ ریزہ کر ڈالتی ہے۔ اُسے ہی نہیں، اُس قوم یا قومیت کی آبرو کو بھی، جس کی پیداوار ہونے کا اُسے شرف حاصل ہوتا ہے۔

یہ میں نے اپنے ہی ملک میں دیکھا ہے کہ لڑکی کی عزّت اتنا سماجی حیثیت نہیں رکھتی، جتنا سیاسی۔۔۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ایک ہندو لڑکی کسی مسلمان لڑکے کے ساتھ بھاگی تھی، جس سے ایکا ایکی ہندوؤں کی اقلیت کو خطرہ پیدا ہو گیا اور وے ڈیپوٹیشن پر ڈیپوٹیشن چیف منسٹر کے پاس جانے لگے۔ مرکز سے افسر لوگ جانچ کے لیے آنے لگے۔ اقلیت تو ایک طرف، اکثریت بھی ڈر سے مِلی جُلی فتح کے احساس سے کانپ رہی تھی۔ کیونکہ فتح اتنی مشکل نہیں، جتنا کہ اُس کے حصول کو برقرار رکھنا جوکھِم ہے۔

اُس دن وادی کے سیکڑوں سال پُرانے چِنار خاموش کھڑے اس نئی صورتِ حال

کو دیکھ رہے تھے اور ہوا اُن کے سروں پر رکھی ہوئی راج ترنگنی اور للّا عارفہ کے صفحے اُلٹ رہی تھی۔۔۔

ایسی حالت میں اگر میں کشمیر کے جمالیاتی حُسن کا ذکر کروں بھی، تو کیسے؟ میں ایک ہندو ہوں، ازل ہی سے بُت پرست، جو دلّی کے ایک مضاف میں رہتا ہوں۔ یہاں کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کرتا ہوں تو مجھے خود ہی یہ احساس ہونے لگتا ہے، جیسے میں کسی مسلمان لڑکی کو چھیڑ رہا ہوں، جس سے جھگڑا ہونے کا ڈر ہے اور اِدھر کی اکثریت، گلا گھونٹ کر مجھے مار دے گی۔ پھر سوچتا ہوں، ڈل، وُولر اور گگری بل کب سے مسلمان ہوئے۔ یہ سامنے کی پہاڑی شنکر آچاریہ ہے تو تختِ سلیمان بھی۔ اسلام آباد ہے، تو اننت ناگ نام بھی چل رہا ہے۔ پٹّن کے پنڈت لوگ اس وقت بھی مٹن کھا رہے ہیں۔ پامپور کے زعفران کا رنگ اسلامی سبز کیوں نہیں؟ انسانی محنت اور آسمانی برکت وادی میں جو گیہوں اور شالی۔۔۔ چاول کے دانے پیدا کرتی ہے، اُن کا ختنہ کر کے کیوں نہیں بھیجتی؟

ہاں، یہ سرپھرے پن، بے عقلی کی باتیں ہیں۔ لیکن اس عقل کے تعطّل ہی کے سلسلے میں تو آدمی کشمیر آتا ہے، تہذیب کا پورا شور، شہروں کا کثیف دھواں پیچھے

چھوڑتے ہوئے۔ اب اگر وہ اکیلا ہو اور اپنے من کے اندھیرے اور تنہائی سے گھبرا کر کہیں باہری خوبصورتی پر جھپٹ پڑے، تو اُس میں اُس ایک شخص کا قصور ہوا، پوری قوم کا کیسے ہو گیا؟ بات اخلاقی اور سماجی سے سیاسی کیسے ہو گئی؟

تعطّل۔۔۔ آپ بچّے سے کیوں کھیلتے ہیں؟ اس لیے نا کہ کچھ دیر کے لیے زندگی کا صرف و نحو بھول سکیں۔ شراب کیوں پیتے ہیں؟ اس لیے نا کہ وجود میں کچھ کم پڑتا ہے، یا پھر زیادہ ہو جاتا ہے۔ عورت سے محبت کیوں کرتے ہیں؟ اسی لیے نا کہ۔۔۔ میں پوچھتا ہوں، بنا ان سب باتوں کے آپ جی سکتے ہیں؟

یہ تعطّل کشمیر میں دساور ہی سے نہیں آتا، یہاں کی اپنی پیداوار بھی ہے، ہوائیں اور نظّارے جس کی پوری مدد کرتے ہیں۔ آدمی، مرغِ کباب، بلکہ میں تو کہتا ہوں، کبابِ مرغ ہو تو بھی اُس کے بال و پر لوٹ آتے ہیں۔ برسوں سے سویا ہوا جمال ایکا ایکی انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتا ہے۔ ہرا بجلی رنگ کا ہرا ہو جاتا ہے اور سرخ بجلی کا رنگ سرخ۔ اور محبت کے گہرے احساس سے آنکھیں چشمے اور جھیلیں ہو جاتی ہیں۔ جذبے ایک ازلی اور ابدی مسرت کے احساس سے شوخ و شنگ پہنے ڈونگوں اور شکاروں میں کہیں بھی چل نکلتے ہیں۔ جیسے ہی ڈل اور نگین

کے کناروں پر بُنی ہوئی سفیدوں کی جھالر سے شکارا پرے جاتا ہے، پانی میں آسمان کی وسعت اور اس میں چھپی ہوئی ٹھنڈی، نیلی پرواز منعکس ہونے لگتی ہے۔ اگر بادل ہوتے ہیں، تو پھر شکارا نہیں ہوتا اور شکارا ہوتا ہے، تو بادل۔۔۔ آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگتی ہیں۔ اور کان سماعت کی حدوں سے پرے کی سننے لگتے ہیں۔ پہلے تُمبک ناڑی سنائی دیتی ہے، پھر سنطور۔ فضا میں ایکا ایکی بِچ نغمے اور رُف جاگ اُٹھتے ہیں اور الفاظ معنی کی تلاش میں دور نکل جاتے ہیں۔ پھر گُلریزؔ اور مہجورؔسی کہیں گھاٹیوں، پہاڑیوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُنہیں واپس لاتے ہیں۔۔۔

اُس دن جب حمدیا بازار سے پیاز گوشت لایا، تو اُس کی حالت ہی دوسری تھی۔ اُس کے پاؤں زمین پر یقینی انداز سے نہ پڑ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ بہت زیادہ تمباکو پی گیا ہے، یا کوئی ایسا نشہ کیا ہے، جس سے اُس کے ہاتھ کی انگلیوں میں رعشہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ زینب سے ملا ہو۔۔۔

زینب حمدیا کی معشوقہ تھی اور ہبّہ کدل کے پاس اپنے آبائی مکان میں رہتی تھی۔ ایک منظم یور، جس کا نام شاید غلام رسول تھا، کی معرفت اس کے باپ کو پیغام

بھیجا گیا، جو تھوڑی لے دے کے بعد منظور ہو گیا۔ پھر حسب معمول بند نوٹ میں چینی سے بنا ہوا ایک بڑا سا طشت بانٹا گیا۔ شال دی گئی۔ خدا اور رسول ہوا۔ مگر نشانی کی تاریخ تک پہنچتے پہنچتے سب کباڑا ہو گیا۔

بات یہ ہوئی کہ بیچ میں زینب کا ممیرا بھائی کود پڑا، جو یہیں سامنے کے ہوٹل میں بیرا گیری کرتا تھا۔ افلاس اور عسرت اُس میں گلے ملی تھیں۔ مگر شریعت کی رو سے اُس کا زینب پر حق زیادہ تھا۔ چونکہ قسمیں لی جا چکی تھیں، شیرینی بٹ چکی تھی، اس لیے معاملہ قاضی کے پاس پہنچا۔

فریقین میں صلح کرانے کے سلسلے میں ایک تیسری ہی بات ہوئی جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی گھن آتی ہے۔۔۔ دیکھیے آپ اصرار نہ کیجیے۔۔۔ ایسی ہی بات ہے، تو پھر سنیے۔۔۔۔۔۔ اٹھارہ انیس برس کی زینب اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی۔ ان کی تمام جائیداد کی وارث، جو دو مکانوں اور شالٹینگ کے پاس بیس ایک بیگھا زمین پر مشتمل تھی اور جو چوری چھپے وڈداری میں دی ہوئی تھی۔

زینب حمدیا کے لیے گُشتابہ ہو گئی۔۔۔ دودھ میں پکا ہوا گوشت، جو ایک طرف تو بہت ہی لذیذ ہوتا ہے اور دوسری طرف کشمیر طعمہ کا آخری حصّہ۔ جب اُسے

مہمان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اُس کے بعد اور کچھ نہیں آئے گا۔

صلح کرانے والے قاضی صاحب نے ایک دن اس کھانے کو دیکھ لیا، جب کہ وہ ڈھکا ہوا نہیں تھا اور۔۔۔

اب زینب کو حمدیا قبول کرتا ہے اور نہ اُس کا ممیرا بھائی، ممّا۔ ہاں، جب زمین جائیداد کی وجہ سے ممّا مان جاتا ہے، تو حمدیا تن کے کھڑا ہو جاتا ہے اور قانون کے سب کاغذ وغیرہ نکال لاتا ہے اور اگر حمدیا اُسے نکاح میں لینے پر راضی ہو جاتا ہے، تو ممّا حق شفعہ کی عرضی دے دیتا ہے۔ قاضی محلہ بدر ہو چکا ہے اور زینب مکان کے بُخارچے میں بیٹھی ایک ایسی شال پر باریک کام کر رہی ہے، جس کا کوئی گاہک نہیں۔۔۔

میں نے حمدیا کو سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ دیکھو حمدیا، اس میں اس غریب زینب کا تو کوئی قصور نہیں۔۔۔!

حمدیا نے میری طرف یوں دیکھا، جیسے میں لاطینی میں بات کر رہا ہوں۔ بالکل غیر

متعلق طریقے سے اس نے بات شروع کی۔۔۔ ”آپ نہیں جانتے، مہاراج؟“

”میں؟ میں کیا نہیں جانتا؟“

”آج کا قتل!“

”قتل؟ کس کا؟ کس نے؟ کون؟“ میں نے ایک دم اُٹھتے ہوئے کہا۔۔۔ میز سے نیچے اخروٹ کی لکڑی سے بنی ہوئی کرسی تڑخ گئی۔ ”کیا زینب۔۔۔؟“

”زینب نہیں۔۔۔ ایک آدمی، سامنے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔“

”پھر؟“

”اس کا کٹا ہوا سر وہاں چار چِناری میں ملا اور دھڑ ہوٹل کی ٹٹّی میں۔“

”نہیں!“

”ہاں مہاراج!“

میں نے گھوم کر دور، بائیں طرف چار چناری کی طرف دیکھا، جو جھیل ڈل کے ٹھیک بیچ ایک چھوٹے سے ٹاپو کی شکل میں تھی اور جس پر چنار کے چار پیڑ

کھڑے تھے۔

دن کے وقت لوگ وہاں پکنِک کرتے اور چاندنی راتوں میں رومانٹک جوڑے دودھ اور پانی کے چھینٹے اُڑاتے۔۔۔ وہاں، چار چناری میں کٹا ہوا سر۔۔۔ اب وہ جگہ میرے لیے کبھی رومان پرور نہ ہو گی، حالانکہ میرا ارادہ تھا کہ ایک دن۔۔۔

سامنے بولے وارڈ پر جیپ نیلا سفید جھنڈا لہراتے ہوئے نکل گئی۔ پھر ایک ٹورسٹ بس گزری، جو شاید مرد عورتوں کو نشاط، شالیمار کی طرف لے جا رہی تھی۔ ایک تانگہ رُکا اور اس میں سے سیر کرنے والے کچھ لوگ نکلے اور سمفنی کے سامنے والے اڈّے کی طرف مڑے۔

اُنھیں دیکھتے ہی شکارے والوں نے اپنے اپنے چپّو چلانے شروع کر دیے اور کشتیوں کو کنارے کی دلدل اور پتھروں میں یوں کھبو دیا، جیسے مہمان لوگ کھانا کھانے کے بعد خلال، پھر سے اسٹینڈ میں کھبو دیں۔ شکارے والے زندگی اور موت سے بے خبر گاہکوں کے لیے جھپٹ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ گالیاں بک رہے تھے۔۔۔ دَل سا، ہئیا رمضانہ! چھٹس۔۔۔

"مقتول شخص کون تھا؟" میں نے حمدیا سے پوچھا۔

"سنتے ہیں آندھرا کا تھا۔"

"ہندو ہو گا؟"

"راجو نام تھا۔ ہو سکتا ہے، معراج دین۔۔۔"

"نہیں۔"

میری ناامیدی بڑھ گئی۔۔۔ "نہیں، وہ ہندو ہو گا، ضرور ہندو ہو گا۔۔۔" میں نے ہنکارا۔

حمدیا اور میں، دونوں ہی ایسے آدمی تھے جو حالات میں بد سے پہلے بدترین کو دیکھ لیتے ہیں۔ اُس کے خیال ہی سے ڈرتے، کپکپاتے ہیں۔ لیکن آخر اسی میں سنسنی آمیز تسکین پاتے ہیں۔ یہ چار چناری۔۔۔ میں تو کبھی رتنا کو وہاں نہ لے جا سکوں۔۔۔

رتنا کوئی نہیں تو کیا؟ کبھی تو ہو گی۔۔۔ یہ ملک، کشمیر جس کے بارے میں کچھ کہتے ہی اُس کا حُسن محدود ہو جائے، یا میری ماں کے سیدھے سادے لفظوں میں۔۔۔

اتنا خوبصورت، جتنا کہ کوئی جھوٹ بولے۔۔۔ اور اس میں ایک کٹا ہوا سر، جیسے کسی شریف گھرانے کی عورت نے کوئی نہایت ہی غلیظ گالی بک دی۔

سامنے کی تیرتی ہوئی کھیتی اور قریب آ گئی تھی۔ ابھی دو تین دن پہلے وہ کچھ نہیں تو سات آٹھ فٹ پرے تھی اور اب مشکل سے چھ انچ۔ ہم سمفنی سے اُس پر لپک سکتے تھے اور کرسی رکھ کر اس پر بیٹھے ہوئے دھوپ تاپ سکتے تھے۔ پیری میسن یا پلے بوائے پڑھ سکتے تھے۔۔۔ تعطّل۔۔۔ اخبار پڑھ سکتے تھے، مگر نہیں۔۔۔ اُس میں قتل کی خبر ہو گی۔۔۔ کشمیر میں قتل۔۔۔

مرڈر اِن دی کیتھیڈرل!

تبھی مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے حمدیا سے پوچھا "کس نے کیا یہ قتل؟ کیوں کیا؟"

حمدیا نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا کسی لڑکی کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ حمدیا نے "ہاں" میں سر ہلا دیا۔

"مسلمان لڑکی؟"

حمدیا نے پھر کوئی جواب نہ دیا، جس کا مطلب تھا۔۔۔ ضرور وہ مسلمان ہو گی۔

اب یہاں آٹے میں نمک کے برابر ہندو کیسے بچیں گے؟ میں ہی بے وقوف ہوں، جو یہاں کی بہت ہی ابتر حالت کو دیکھتے ہوئے بھی چلا آیا۔

مان لو دنگانہ بھی ہو، تو ہو سکتا ہے دشمن الپتھّر، گل مرگ کی رداؤں میں سے ہوتا ہوا بڑ گام اور اننت ناگ یا اسلام آباد کی طرف پھیل جائے اور وطن کو بھاگنے کی ایک ہی سڑک کو کاٹ دے۔ ہوائی جہاز سے کتنے لوگ جا سکیں گے؟ مگر نہیں، فوج کے جیالے بھی تو ہیں، جو اُولوں اور برف کے بیچ میں ڈٹے ہوئے سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔

بہت کُریدنے پر مجھے پتہ چلا کہ مقتول راجو کی بیماری، عقل کا تعطّل، ایک خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی۔ تیسرے درجے کی ٹی بی یا کینسر کی طرح۔ طوائفوں کا بازار۔۔۔ تاشا دان تو قانوناً بند تھا، اس لیے بیرا اُسے اپنی پہچان کی کسی دھندے والی کے پاس لے گیا، جہاں اُس نے جیب سے نوٹ نکالے، جو گنتی میں تین ہزار کے قریب تھے اور اُس بیرے نے دیکھ لیے۔ پھر جب وہ اپنے ہوٹل کو لوٹ کر آیا، تو وہی۔۔۔ دھڑ ہوٹل کی ٹٹّی میں اور سر چار چناری میں۔۔۔

یکایک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے حمدیا سے پوچھا۔ ”کون تھا؟ کون تھا وہ بیرا؟“

حمدیا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔۔۔ ”ممّا۔“

”کہاں لے گیا تھا اُسے؟“

اب حمدیا کے ہونٹ بھی کانپ رہے تھے۔

یہی تو ہے نہ کشمیر، جہاں کی بدصورت سے بدصورت چیز بھی ایک خوبصورت پس منظر لیے ہوتی ہے۔ تھانہ بھی ایک پہاڑی کی گود میں تھا، جہاں گلاب کی کیاریوں کے بیچ ایک چھوٹا سا راستہ بل کھاتا ہوا اوپر ہی اوپر جاتا نظر آتا تھا۔ میں اب تک اتنا ڈر چکا تھا کہ خطرے کے بیچ میں پہنچ گیا۔۔۔ یہ دیکھنے کہ دنگا ہوتا ہے، یا نہیں؟ انسان کا کٹا ہوا سر کیسا دکھائی دیتا ہے!

انسپکٹر غلام یزدانی چھ فٹ کا ایک لچکیلا مگر مضبوط آدمی تھا۔ اُس کی ناک بہت تیکھی اور رئیسانہ تھی اور کناروں سے ایک دم سُرخ اور نمناک دکھائی دیتی تھی۔ وہ مجھے بڑے تپاک سے ملا، جس سے اس بات کی تائید ہوئی کہ ٹورسٹ

لوگ کیسے بھی ہوں، خلوص سے پیش آنا ہر کشمیری اپنا فرض سمجھتا ہے۔۔۔

راجو کا سر ایک منقّش تھالی میں رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔۔۔ پتھرائی ہوئی، مردہ آنکھیں، جن میں کسی چیز کا عکس نہیں پڑتا۔ سپاٹ، کالے رنگ کے چہرے کی وجہ سے آنکھوں کی سفیدی اور بھی سفید دِکھ رہی تھی۔ ڈوروں تک سے خون نچڑ چکا تھا۔۔۔

یہ ماں کا لال، کشمیر میں سیر کی غرض سے آیا تھا! جب گھر سے چلا ہو گا، تو اِسے کیا پتہ ہو گا۔۔۔ سنسناتے ہوئے تار اُس کے قتل کی خبر اس کے سگے سمدھیوں تک پہنچا چکے ہوں گے۔۔۔ تبھی میں نے دیکھا کہ سر کو دیکھنے کے لیے جمع لوگوں میں سے ایک آدمی ڈر کر پیچھے ہٹ گیا، پھر دوسرا ہٹ گیا۔

مجھے اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ انسپکٹر غلام یزدانی مسکرا رہا تھا۔ ٹھیک ہی تھا۔ پولیس والوں کے لیے یہ روز مرّہ ہے۔ اُس نے ہنستے ہوئے مقتول کا منہ میری طرف کر دیا۔ اب وہ کٹا ہوا سر مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے اچانک یوں لگا، جیسے وہ کہہ رہا ہے۔۔۔ میرا قتل تم نے کیا ہے، تم نے۔۔۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا اور اُس مہذّب انسپکٹر کو سلام دُعا کیے بنا وہاں سے بھاگ آیا۔

میں نے کافی ہاؤس میں کافی پی۔ ریڈیو اور اُس کی ڈراما یونٹ کے کچھ لوگوں سے ملا۔ کچھ جرنلسٹوں اور پروفیسروں سے بات کی۔ احدُو کے یہاں کھانا کھایا، حالانکہ کھانا میں پہلے بھی سمفنی میں کھا چکا تھا۔

پھر میں بندھ پر ٹہلنے کے لیے نکل گیا۔ یہاں کئی رتنائیں شوخ اور بھڑکیلے کپڑے پہنے گھوم رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک نے لال رنگ کا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔۔۔ انسان کتنا ہی سر پٹخے، خون کے رنگ سے زیادہ سُرخ رنگ نہیں پیدا کر سکتا۔ پھر ڈاک خانے جا کر دیکھا، میرے نام کا کوئی خط آیا ہے، یا نہیں۔۔۔ کسی کے بیٹے کا مُنڈن کا دعوت نامہ تھا۔ جوری ڈائریکٹ ہو کر یہاں پہنچ گیا۔ ایک بات میں نے دیکھی کہ میں جہاں بھی جاتا تھا، لوگ اسی قتل کی باتیں کرتے تھے اور اس کے بعد مجھے دیکھ لیتے تھے، جیسے۔۔۔

میں نے پہلے سے سنیئر کارڈیرو کا ڈنر منظور نہ کیا ہوتا، تو کبھی فلائنگ جیک میں نہ جاتا، جس کے عین مین سامنے وہ ہوٹل ہے، جس میں مقتول آکر رہا۔ راجو کا سر اور اُس کی آنکھیں میرے دماغ کی فوٹو پلیٹ پر کچھ یوں نقش ہو گئی تھیں کہ ماضی کی خوبصورت اور بدصورت یادیں اور مستقبل کی امید و بیم بھی انہیں نہ مٹا سکتی

تھیں۔ اُسے حال ہی دھو سکتا تھا۔۔۔ کوئی اور منظر دیکھوں، کچھ اور لوگوں سے ملوں، لیکن ہر ایک منظر، ہر ایک چہرے پر وہی کٹا ہوا سر سُپر اِمپوز کیا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

سنیوُر کارڈیرو نے کچھ اور بھی مہمان بُلا رکھے تھے۔ اُن میں سے کچھ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور علی گڑھ سے آئے تھے، طالب علموں کو اُردُو پڑھانے، کیونکہ کشمیر کی سرکاری زبان اُردُو ہے، مادری چاہے کچھ بھی ہو۔ کچھ سیاسی قسم کے لوگ بھی تھے، جن میں زیادہ باہر سے آئے تھے۔ ایک ریاست کی اسمبلی کے اسپیکر کا چمچہ تھا، جو اپنے طریقے سے کشمیر کا ایک چھوٹا موٹا لیڈر تھا۔ ایک تیس بتیس سال کی سلونی سی ہندو عورت تھی۔۔۔ مسز داس، جس کا پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ پنجابن ہے یا بنگالن۔

یہ نہیں کہ مسٹر داس نہیں تھے۔ وہ بھی تھے۔ لیکن صرف تھے۔ مسز داس اور سینیوُریتا مل کر ایک ایسی زبان میں باتیں کر رہی تھیں جو الفاظ سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ وہاں کا ڈرائینگ روم ہمارے سمفنی کے ڈرائینگ روم سے تھوڑا بڑا تھا۔ اور اسی میں وہسکی کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں دی جا رہی تھیں۔

سینیوُریتا نے آج ایک ساڑھی پہن رکھی تھی، جس نے اُس کے جسم کے جملہ عیوب کو ڈھک دیا تھا۔ اور اب وہ جذبہ خیز عورت نظر آتی تھی۔ ایک بات مجھے حیران کیے دے رہی تھی اور وہ یہ کہ سینیوُریتا کھانے کی کوئی چیز کسی بھی مہمان کے سامنے رکھتی، تو روسی زبان کا ایک لفظ ضرور استعمال کرتی۔۔۔ پشر الستہ۔۔۔

سینیوُریتا کارڈیرو، اور یہ پشر الستہ؟

کیا سینیوُریتا ایک روسی عورت تھی، جو اپنے ملک سے بھاگ کر امریکہ، گواٹے مالا چلی گئی تھی؟ یا سنیوُر۔۔۔؟ مگر یہ سب شخصی سوال تھے، جنہیں میں پوچھ نہیں سکتا تھا۔ البتّہ ایک اور بات، جس نے مجھے حیران کر دیا، وہ یہ تھی کہ سنیوُر کشمیر کے پھول پتّوں، کیڑے مکوڑوں، مچھلیوں اور جانوروں کے بارے میں کسی بھی کشمیری سے زیادہ جانتا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ ایک گاؤں (کہ وہ کہاں پر بسا ہے) کے سلسلے میں چمچہ صاحب سے بحث ہو گئی۔

سنیوُر کہہ رہا تھا کہ وہ گاؤں اُڑی، چکوٹھی کے پاس جہلم دریا کے دائیں کنارے پر بسا ہے اور چمچہ صاحب کے مطابق بائیں پہ۔ آخر جانچ پڑتال کی گئی۔ نقشے

منگوائے گئے اور پتہ چلا کہ سنیئر کارڈیر و ٹھیک کہتا ہے۔ تب میرے دل نے مجھ سے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ کیا حاکم لوگ جانتے ہیں کہ یہ آدمی کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کشمیر کے بارے میں اتنی جانکاری رکھنے کی کیا وجہ؟ ایک اور بات۔ کارڈیرو نے نیلی پٹّی والے جنرل کو کیوں نہیں بلایا؟ کیا اس لیے کہ وہ لوگ صرف آئینے ہی کی زبان سمجھتے ہیں؟

ان لوگوں میں ایک سیدھا سادہ کشمیری بھی تھا، جو اپنے سر پر کالے رنگ کی قراقلی ٹوپی پہنے بیٹھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ کوئی دیہاتی ہے، اتّفاق سے جس کی فصل اب کے سال اچھی ہوئی ہے۔ مگر اُس کو یہاں کے اتنے پڑھے لکھے لوگوں میں بُلانے کا مطلب؟

وہ مجھ سے غلام رضا کے نام سے متعارف کرایا گیا۔ اور میں اُن کشمیریوں کے بارے میں سوچنے لگا، جو اب تک مجھ سے ملے تھے، یا جن کا نام میں نے سنا تھا۔۔۔ غلام ہمدانی، غلام محمد (ممّا)، غلام علی۔۔۔ یہاں یہ کیا خاندانِ غلاماں اکٹھا ہو گیا تھا؟

پھر وہی کٹا ہوا سر، جس کی یاد کشمیر کے سیاسی نزع نے بھُلا دی۔ سب اِسی

اطمینان کے ساتھ کہ شہر میں دنگا نہیں ہوا، کشمیر کے ماضی و مستقبل کے بارے میں لے دے کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ استصواب رائے سے کشمیر پاکستان کو جانا چاہیے۔ دوسرا برس پڑا۔۔۔ اس میں استصواب رائے کا سوال ہے یا دستور کا۔۔۔ مسز داس نے ایک اور ہی بات شروع کر دی۔۔۔ "کیوں چھوڑ دیں؟ ہم کشمیر کیوں چھوڑ دیں؟ کیوں بیکار جانے دیں اُن کروڑوں، اربوں کو، جو ہم نے یہاں کے ڈیفنس کے لیے خرچ کیے ہیں؟" مسز داس یوں ظاہر کر رہی تھیں، جیسے کسی نے اُن کے پرس سے پیسے نکال کر اُسے خالی کر دیا ہے۔ اُن کی یہ بات عورت ہونے کے ناتے معاف کر دی گئی۔۔۔

مسٹر داس، جو اپنے کوٹے سے زیادہ پی گئے تھے، ہنکار اُٹھے۔۔۔ "انجو! تم عورتیں صرف ایک ہی کام کے لیے بنی ہو۔۔۔!"

اس پر جب سینیورِیتا نے بھی صدمے سے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر 'ہو' کہا، تو مسٹر داس نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔۔۔ "پیار کے لیے!" پھر زیادہ پیے ہونے کی وجہ سے وہ پیار لفظ کا ہر ایک غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنے لگا۔۔۔ آمور، لیبلُو، حُبّ۔۔۔!

سینیوریتا چھاتی پر ہاتھ رکھے فرانسیسی لہجے میں کہہ رہی تھی۔۔۔ فیودل، مسٹر داس، ویری فیودل۔۔۔ اور مسز داس کا چہرہ غم و غصّے سے لال ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھر پین ایم، پہنچ کر مسٹر داس کی خوب ہی پٹائی کرے گی۔

باتیں چل رہی تھیں۔۔۔ ایک کلمہ، ایک قرآن، ایک نبی۔۔۔ اور آپ کا سب پروپگینڈہ بیکار۔۔۔ کیوں نہ کشمیری لوگ ہندستان کو گالی دیں؟ وہ جان گئے ہیں نا، گالی دیں گے، تو پیسہ ملے گا۔۔۔ یہ سب غلطی پنڈت جی کی ہے۔ شروع ہی میں وہ جرنیلوں کے ہاتھ نہ روکتے، تو کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔۔۔ آرٹیکل ۳۷۰۔۔۔ پاکستان سے آئے ہوئے سبھی مہاجرین کو یہاں کشمیر میں بسا دیتے، تو۔۔۔ سردار پٹیل نہ ہوتے، تو ہندستان کبھی کا بلقایا گیا ہوتا۔۔۔

وہ تو بادشاہ ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے، شیخ صاحب۔۔۔

اجی ہٹاؤ، بخشی صاحب نے ڈنڈے سے حکومت کی۔ کشمیری ایک ہی زبان سمجھتا ہے اور وہ ہے ڈنڈے کی زبان۔ ایسے ہی تو نہیں تواریخ میں کشمیری کو ظلم پرست کہا گیا؟ صادق صاحب ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔۔۔ جس چیز کو دبایا جائے گا، وہ اور اُبھرے گی۔ کیوں نہ اُسے منظرِ عام پہ لا کر تحلیل کر دیا جائے؟ پھر پرتاپ سنگھ،

شیاما پرساد مکھرجی، دیک فیلڈ، ملکہ پکھراج، ہری سنگھ۔۔۔ ہر طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ خطرناک اور خطرے سے خالی، ہر ایک شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ کشمیر کی جملہ بیماریوں کا علاج اُس کے پاس ہے۔ اُن سب میں سے صرف غلام رضا چُپ تھا۔ جب بھی کوئی بات کرتا، تو وہ اپنا سر اُس کی طرف موڑ لیتا اور خالی خولی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ میں نے بات شروع کی۔۔۔ میرا خیال ہے۔۔۔

تبھی غلام رضا نے اپنی نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور میں بھول ہی گیا، میں کیا بڑی بات کہنے جا رہا تھا؟ جیسے پروفیسر کول نے میری بات کاٹی، رضا نے اُس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ویسے ہی خاموش، ویسے ہی جامد، ویسے ہی ساکت، غیر معکوس انداز سے۔۔۔ ایک ٹھنڈا پسینہ میری پیشانی پہ دوڑ گیا۔ جی چاہا کہ اُٹھوں اور ایک دم چیخ کر کہوں۔۔۔ بولو۔۔۔ رضا، یا ہتنز! بولو، تم بھی تو کچھ بولو۔۔۔! میں نے اُس کا نام ہی لیا تھا کہ اس کی نظروں کی بے نور، مردہ اور بے رحم ٹکٹکی مجھ پر تھی۔ میں نے سنیؤر سے معافی مانگی اور نہ سینیؤریتا سے اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔۔۔

اگلے ہی روز میں دلّی میں تھا، جہاں میری طرف کوئی نہیں دیکھتا۔

آئینے کے سامنے

مجھے آج تک پتا نہ چلا، میں کون ہوں؟

شاید اس سے کوئی یہ مطلب اخذ کرے کہ میں عجز و انکسار کا اظہار کر رہا ہوں، تو یہ نادرست ہو گا۔ عین ممکن ہے کہ جو آدمی کسی دوسرے کے آگے نہیں جھکتا، یا کسی خاص مدرسۂ فکر و خیال یا مذہب یا "ازم" کی پیروی نہیں کرتا، عجز کا حامل ہو اور وہ شخص جو بہت ہاتھ جوڑتا ہے، جھک جھک کر بات کرتا ہے، انا کا بدترین نمونہ۔۔۔

بلکہ بہت انکسار کا اظہار کرنے والا شاید زیادہ خطرناک انسان ہوتا ہے۔

اَپرا ہدی دونانوِیں، جیوں ہنستاں مر گانہہ

گرنتھ صاحب

اَپرا ہدی دُگنا جھکتا ہے، جیسے ہرن کو مارنے کے لیے شکاری!

میں جانتا ہوں، میں عام طور پر ایک سادہ اور منکسر المزاج آدمی ہوں، لیکن مجھ پر ایسے لمحے آتے ہیں، بادی النظر سے دیکھنے والا جسے میری انا سے تعبیر کر سکتا ہے۔ وہ لمحے اُس وقت آتے ہیں جب میں کوئی ادبی چیز لکھنے کے لیے بیٹھوں۔ مضمون میرے ذہن میں ہو۔ بات نئی اور مختلف اور مجھے اسے کہنے کے انداز پر ایک اندرونی طاقت اور صحت کا احساس ہو۔ جب معلوم ہوتا ہے، میں اپنے آپ کو ایک غیر شخصی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں۔۔۔ ہٹ جاؤ، میں آرہا ہوں، باادب با ملاحظہ ہوشیار یا۔۔۔ ساودھان، راج راجیشور، چکرورتی سمراٹ۔۔۔ رنگ بھومی میں پدھارتے ہیں۔۔۔

چونکہ ایسے احساس کے بغیر لکھنا سہل نہیں، اس لیے میری یہ لمحاتی انا انکسار سے

دور کی بات نہیں۔ اس وقت کاغذ اور میرے درمیان کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اپنے گھر بیٹھ کر کوئی اپنے آپ کو کالی داس یا شیکسپیئر سمجھ لے، اس سے کسی کا کیا جاتا ہے؟ البتّہ لکھ لینے اور پبلشر کے پاس پہنچنے تک بھی وہ اپنے آپ کو عظیم سمجھتا رہے تو بڑا احمق آدمی ہے۔ اوّل تو کاغذ پر نزول ہوتے ہی اپنی اوقات کا پتا چل جاتا ہے، اور جو نہ چلے تو دوست بتا دیتے ہیں اور جو زیادہ بے عزّتی کرنا چاہیں تو بتاتے بھی نہیں۔

ہاں، تو میں کون ہوں؟

عام طور پر یہی پوچھا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کون ہے؟ یا کیا ہے؟ مطلب یہ کہ کیا کام کرتا ہے؟ یہ دو سوال میرے سلسلے میں غیر ضروری ہیں کیونکہ چند لوگ مجھے جانتے ہیں۔ کیا کام کرتا ہوں؟ اس سے بھی واقف ہیں۔ بھلا ہو فلموں کا، جنہوں نے مجھے رسوا کر دیا۔ یہ دنیا اشتہاروں کی دنیا ہے۔ مشتہر انسان کی طرف لوگ آنکھیں پھیلا کے دیکھتے ہیں لیکن مشتہر آدمی کو اپنے جانے پہچانے ہونے کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اس سے عام آدمی واقف نہیں اور اس لیے شہرت کی تمنّا کیا کرتے ہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ ہماری فلموں کے ہیرو لوگوں سے پوچھیے۔

کیا وہ اپنی زندگی کا ایک بھی لمحہ فطری طریقے سے گزار سکتے ہیں؟ وہ گھر میں ہوں تو بیوی کے لیے بھی ہیرو بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں، جو کہ ان کی رگ رگ پہچانتی ہے اور مسکراتے ہوئے کہتی ہے

بہر رنگِ کہ خواہی جامہ می پوش

من اندازِ قدت رامی شناسم

اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کتّا یاد آتا ہے (میں پھر انکسار کا اظہار نہیں کر رہا) جسے ایک ڈائریکٹر نے اپنی ایک فلم میں لیا۔ کتّا فلم کے تسلسل میں آ گیا۔ یعنی سین نمبر بارہ میں آیا تو سین نمبر اکیاون میں بھی اس کی ضرورت تھی۔ اور وہ سین چھ مہینے کے بعد لینا تھی۔ بے چارہ اچھا بھلا کتّا تھا۔ بازار میں گھومتا، کوڑے کے ڈھیر یا اِدھر اُدھر ہر جگہ کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں سر دھنتا تھا، لیکن فلم میں آ جانے کے بعد وہ ایک معیّن تجارتی چیز، ایک جنس بن گیا جو بِک سکتی تھی، جس کا بھاؤ تاؤ ہو سکتا تھا۔ اس لیے ڈائریکٹر صاحب نے اسے باندھ کر رکھ لیا۔ اب بیچارے کو دِن میں تین چار وقت کھانا پڑتا تھا۔ سونے کے لیے گدّے استعمال کرنے پڑتے۔ زکام لگنے پہ سلوتری کو بُلوایا جاتا تھا۔ اور ہر آدمی کے آنے

پر کتّا زور زور سے دُم ہلاتا۔ وہ انسان کو فرشتہ سمجھنے لگا۔ یعنی جتنا کہ کتّا شیطان اور فرشتے کے درمیان تمیز کر سکتا ہے۔ چنانچہ فلم بنتی رہی اور کتّا صاحب موج اُڑاتے رہے۔ اُدھر فلم ختم ہوئی اِدھر انہیں آزاد کر دیا گیا۔ لیکن اب کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے روزی کُریدنے کی اسے عادت نہ رہی تھی۔ وہ بار بار گھوم پھر کے وہیں پہنچ جاتا اور پہلے سے زیادہ زور سے دُم ہلاتا، جس کے جواب میں اُسے ٹھوکر ملتی۔ اور چوں چوں کرتا ہوا وہ وہاں سے بھاگ جاتا۔ لیکن پھر گھوم کر وہیں۔۔۔ وہی حیرانی، وہی کشت، وہی گالی۔۔۔ یہ ڈائریکٹر کتّا نہیں۔۔۔ کوئی انسان ہے!

یہ اس آدمی کی حالت ہے جو شہرت میں بہک جاتا ہو۔ یا زندگی میں کسی مرتبے، مقام کا بھوکا ہو۔ پیسے چاہتا ہو جس سے وہ ہر چیز کو خریدنے کی طاقت حاصل کر سکے۔ قانون، مذہب، سیاست سب کو جیب میں ڈال لے۔ لولِتا کے ہیرو کی طرح کسی نفسیاتی اُلجھن کا شکار ہو جائے، مزے اُڑائے۔ اور لوگ داد دیں۔۔۔ ''بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں!'' شہرت، مرتبہ، مقام، پیسا ایسی خطرناک چیزیں ہیں کہ انہیں حاصل کرنے کے بعد ہر شریف آدمی ان کا تیاگ کرنا چاہتا ہے

لیکن، میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا، کی طرح یہ چیزیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ یہ بھی محلِ نظر ہے کہ وہ شخص خالی خولی باتیں کرتا ہے یا واقعی ان چیزوں کو چھوڑنا بھی چاہتا ہے؟

ایک دفعہ کا ذکر ہے، میرے ایک چاہنے والے، میرے مدّاح مجھے مل گئے۔ انہوں نے میری کچھ کہانیاں پڑھی تھیں۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے جو زندگی کا راز جانتے ہیں۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ سیدھے مطلب پر آ گئے۔۔۔

"بیدی صاحب۔۔۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"جی؟" میں نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا۔ "میں جی (پنجابی انداز)"

"جی، میں تو کچھ بھی نہیں۔"

اور جب انہوں نے مجھ سے اتّفاق کیا تو مجھے بڑا غصّہ آیا!

میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کے سوال تو ختم ہوئے۔ دراصل یہ سوال مجھ پہ لاگو ہی نہیں ہوتے۔ میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں، جن سے پوچھنا چاہیے۔۔۔ "آپ،

کیوں ہیں؟۔۔۔یعنی کہ آخر۔۔۔کیوں؟"

یہ بھی میں نہیں جانتا!

واقعی دنیا میں کروڑوں انسان روز پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب میں سے ایک میں بھی ایک دن ایکا ایکی پیدا ہو گیا۔ ماں کو خوشی ہوئی ہو گی، باپ کو ہوئی ہو گی۔ لیکن دائیں ہاتھ کے پڑوسی کو پتا بھی نہ تھا اور پڑوسی کو پتا ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔ وہ ضرور مبارک باد دینے کے لیے آیا ہو گا لیکن رسمی طور پر۔ میرے پیدا ہو جانے سے اسے کیا خوشی ہو سکتی تھی؟ اُلٹا اس تجارتی دنیا میں اس کے لڑکے پنّا لال کا مدِّ مقابل پیدا ہو گیا۔ اس کا حریف۔ اس کی پیدا ہونے والی لڑکی کے لیے خواہ مخواہ کا خطرہ۔۔۔ تو گویا ایک قاعدہ بنا ہوا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی پیدا ہو تو مبارک باد دو۔ چوہڑ سنگھ ہو تو بدھائی دو۔ ڈھلّو رام یا چھجّے خاں آ جائیں تو خوشی مناؤ، ڈھول بجاؤ۔

ٹیگور کہتے ہیں، دنیا میں ہر روز جو اتنے انسان پیدا ہو جاتے ہیں، اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ابھی انسان بنانے سے نہیں تھکا۔ خدا کی کتنی ستم ظریفی ہے۔ چونکہ وہ تھک نہیں سکتا، اس لیے انسان بناتا جا رہا ہے!

بیکار مباش کچھ کیا کر

پاجامہ اُدھیڑ کر سیا کر

چنانچہ خدا کے پاجامے کا آخری ٹانکا یعنی یکم ستمبر ۱۹۱۵ کی سویر کو لاہور میں ۳ بج کر ۷ منٹ پر، صرف مہا کوی ٹیگور کو ثبوت مہیا کرنے کے لیے پیدا ہو گیا۔۔۔ رام اور رحیم انسان کی طرح بھول گئے کہ یہ دنیا دُکھ کا گھر ہے۔ ورنہ اس دنیا میں مجھے بھیجنا رحمت کی بات تھی؟ بلکہ شاستروں کے مطابق کوئی بدلا لینے کی۔ کوئی کرم پچھلے جنم میں کیے ہوں گے جنہیں خدا کی رحمت بھی معاف کرنے کی قدرت نہ رکھتی تھی۔

جیسے ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو، تو کلکٹر بنے، ایسے ہی میرے ماں باپ کی خواہش تھی۔ ان بیچاروں کا کیا قصور؟ اِن کی سوچ ہی کلکٹر تک محدود تھی۔ انہیں کیا معلوم کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے سامنے کلکٹر پانی بھریں۔ جیسے سیدھا سادا ایک جاٹ مال گزاری کے سلسلے میں تحصیلدار کے سامنے پیش ہوا تو تحصیلدار صاحب نے جاٹ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ جاٹ نے بہت خوش ہو کر دعا دی۔۔۔ ”خدا کرے تحصیلدار صاحب، آپ ایک دن

پٹواری بنیں۔۔۔"

کمپٹیشن کی اس دنیا میں لوگ بڑے بڑے حوالے دیتے ہیں۔ ایک ایسی سازش ہوتی ہے، عام آدمی فوراً جس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں۔۔۔ لنکن لاگ کیبن میں پیدا ہوا اور اسٹیٹس کا پریذیڈنٹ بنا۔ لاگ کیبن سے پریذیڈنٹ کی روایت کا ذکر کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ کتنے لوگ ہیں جو جھونپڑی سے راج بھون تک پہنچے۔ اس دھوکے، اس سازش کے شکار ہو کر لاکھوں، کروڑوں سر پٹختے مر جاتے ہیں اور پھر

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر

اس کے بعد بھی آپ خدائی اور خلقت سے ناانصافی کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی۔

میں ایک بیمار بچہ تھا۔ ایک بیمار ماں کا بیٹا۔ میں نے تپِ محرقہ میں وہ غیر مشتکل ہچکولے دیکھے ہیں جن کا مرکز مریض خود ہوتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کے گوپھیے میں ڈال کر اسے بار بار دور، کسی موت کے اُفق سے پار پھینکا جا رہا ہے۔ میں نے سرہانے میں آنکھیں دبا کر، ایک دوسرے میں گڈ مڈ

ہوتے ہوئے وہ ہزاروں رنگ دیکھے ہیں، جو کسی عکس کی زد میں نہیں آتے اور طیّب جن کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہے، قوسِ قزح جن کی حد باندھنے سے عاری۔ وہ آنسو روئے ہیں جو نمکین تھے اور نہ میٹھے۔ جو کسی ذائقے کی قید میں نہیں آتے۔ اور جسے پیار کرنے والے ماں باپ، بھائی اور بہن یا محبوبہ نہیں پونچھ سکتی۔ سیکڑوں بار میں کسی لق و دق ویرانے میں اکیلا رہ گیا ہوں اور ایکا ایکی ڈر کی پوری شدّت کے ساتھ مجھے محسوس ہوا کہ کروڑوں یوجنوں تک میرے پاس کوئی نہیں، میں بھی نہیں۔۔۔

بیسیوں بار میں نے انگلستان کا وہ بازار دیکھا ہے، یا بنارس کا وہ گھاٹ جہاں پچھلے جنموں میں مَیں پیدا ہوا تھا۔۔۔ گنگا طغیانی کے بعد ہٹ گئی ہے اور کناروں کے قریب سرخی اور زردی سے ملی جلی مٹی کے بیچ ہزاروں لاکھوں چھوٹی چھوٹی ندیاں چھوڑ گئی ہے۔ جہاں پیر پڑتا ہے تو ایک ندی اور بہہ نکلتی ہے۔۔۔ اور وہاں آٹھ نو برس کا ایک سیاہ فام بچّہ، ننگا، کمر میں سیاہ تاگا باندھے، سر پر چوٹی رکھے کھڑا ہے اور وہ۔۔۔ میں ہوں۔۔۔

اس سے پہلے کہ میں بڑا ہو کر اپنی نسوں کو بدکاری اور کاروباری حادثات میں تباہ

کر لیتا، میرے اعصاب ختم ہو چکے تھے۔ ذرا اسی بات پر ناراض، ذرا اسی بات پر ریں ریں روں روں۔۔۔ ماں جھلّا کر مجھے دور پھینک دیتی تھی کیونکہ میں اس کی بیمار چھاتی تک چچوڑ ڈالتا تھا۔۔۔ ماں، تم ہو نہ ہو، مجھے میرا دودھ دے دو۔ میں آج تک پکار رہا ہوں۔۔۔ ماں! مجھے میرا دودھ دے دو۔ اور ماں کہیں نہیں ہے۔۔۔ اس کا مطلب جانتے ہیں؟۔۔۔ ماں کہیں نہیں ہے۔ ہاں تو، ایک بار پھینک دینے کے بعد اتھاہ مادریت کے عالم میں، ماں مجھے پھر اٹھا لیتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، مجھے رکھے یا پھینک دے۔۔۔

میں کئی بار مرا اور کئی بار زندہ ہوا۔ ہر چیز کو دیکھ کر حیران، ہر سانحے کے بعد پریشان۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ پریشانی کی کوئی انتہا نہیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، جیوتش لگوائے گئے۔ جیوتش نے کہا۔ لگن میں کیتو ہے اور بر ہسپت اپنے گھر سے بُدھ پر درشٹی ڈالتا ہے۔ یہ بالک کوئی بہت بڑا اکلا کار بنے گا۔ لیکن چونکہ شنی کی درشٹی بھی ہے، اس لیے اسے نام مرنے کے بعد ملے گا۔۔۔ سوریہ سوگریہ ہے، دھن اور لابھ استھان میں پڑا ہے۔ اور اسی گھر میں شکر ہے، جسے سوریہ نے اپنے تیج سے اِستھر کر دیا ہے۔ چونکہ شنی شکر کو دیکھتا ہے اس لیے

اس کے جیون میں بیسیوں عورتیں آئیں گی۔ شنی اور شکر کا یہ میل شاید اسے کوٹھے پر بھی لے جائے، لیکن برہسپتی گھر کا ہونے کے کارن کبھی بدنامی نہیں ہو گی۔۔۔ لیجیے!

پھر منگل بھی سنیچر کے ساتھ پڑا ہے۔ اگر دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن پھر بھی منگل منگل ہے، اثر تو کرے گا ہی۔ کام چلتے چلتے ایک دم رُک جائیں گے۔ خاص طور پر اُن دنوں جب کہ برہسپتی وکریہ ہو گا۔ دسویں گھر میں راہو ہے جسے منگل دیکھتا ہے، اس لیے پتنی ہمیشہ بیمار رہے گی۔ گویا میرے باپ کی بیوی بیمار، دائم المرض اور میری بیوی بھی۔۔۔ پورے خاندان کو شراپ لگا تھا!

چنانچہ آج تک میں نے ایک بیوی کی زندگی تباہ کرنے اور چند بچوں کا مستقبل خراب کرنے کے علاوہ کوئی اُپجاؤ کام کیا ہے تو یہی صفحے کالے کرنا، کچھ کتابیں لکھ ڈالنا اور پھر خود ہی اُن کو خریدنے کے لیے چل دینا۔

میری ماں برہمن تھیں اور میرے پتا کھشتری۔ اس زمانے میں اس قسم کی شادی گریٹنا گرین میں بھی نہ ہو سکتی تھی، لیکن ہو گئی۔ میرے ماں باپ ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ اس لیے گھر میں ایک

طرف گرنتھ صاحب پڑھا جاتا تھا تو دوسری طرف گیتا کا پاٹھ ہوتا تھا۔ پہلی کہانیاں جو بچپن میں سنیں، جن اور پری کی داستانیں نہ تھیں، بلکہ مہاتم تھے جو گیتا کے ہر ادھیائے کے بعد ہوتے ہیں اور جو بڑی شردھا کے ساتھ ہم ماں کے پاس بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چند باتیں جو سمجھ میں آ جاتی تھیں جیسے راجا۔۔۔ برہمن۔۔۔ پشاچ۔۔۔ لیکن، ایک بات۔۔۔

"ماں! یہ گنِکا کیا ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے، آرام سے بیٹھو۔"

"اُوہوں، بتاؤنا۔۔۔گنِکا۔۔۔"

"چپ"

اور پھر وہ دَیا جو ماں ہی کو آسکتی ہے، جب وہ اپنے بچّے کے چہرے کو ایکا ایکی کمھلاتے ہوئے دیکھتی ہے۔۔۔

"گنِکا بُری عورت کو کہتے ہیں۔"

"تم تو اچھی ہونا، ماں؟"

”ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔۔۔کسی کی بھی ہو؟“

”تو پھر بُری کون ہوتی ہے؟“

”تو تو سر کھا گیا ہے، راجے۔۔۔بُری عورت وہ ہوتی ہے جو بہت سے مردوں کے ساتھ رہے۔“

میں سمجھ گیا لیکن دوسرے دن مجھے بے شمار جوتے پڑے۔ ہوا یہ کہ میں نے پڑوس میں سومتری کی ماں کو گِنکا کہہ دیا کیونکہ اس کے گھر میں دیور، جیٹھ اور دوسرے انٹ سنٹ قسم کے کئی مرد رہتے تھے۔

چنانچہ میری باقی کی زندگی سب ایسی ہی ہے۔ اِدھر میں نے سوال کیا، اُدھر زندگی نے کہا۔۔۔”چُپ۔“

اور جو کبھی جواب بھی دیا تو ایسا کہ میں اسے سمجھ ہی نہ سکوں۔ اور سمجھ جاؤں تو جوتے پڑیں۔

میری جسمانی کمزوری، نسوں کا اُلجھے ہونا، میرے سوالوں کا جواب مناسب طور پر نہ دیے جانا، یا جواب کی ماہیئت کا نہ سمجھنا، ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی بچے میں

احساسِ ذات پیدا کر سکتی ہیں اور وہ ضرورت سے زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے، حسّاس ہونے لگتا ہے۔ پھر زندگی میں سیدھے سادے اندھیرے کے علاوہ مہا شُونیہ بھی ہے۔۔۔ مقام ہُو۔۔۔ اور بیسیوں ڈر ہیں، خطرے ہیں، مایوسیاں جو دل میں ہر وقت لرزہ پیدا کیے رہتی ہیں۔ جیسے بجلی کا موہوم اشارہ بھی ڈایا فرام میں جُھرجُھری پیدا کر دیتا ہے۔۔۔ باقی کی چیزیں واقعات اور تجربات ہیں، جو ہر مصنّف کی زندگی میں آتے ہیں۔ وہ اُن سے سیکھتا، اُن کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر اسے کاغذ پر اُتارنے کی کوشش۔

یوں جانیے کہ پانچ برس کی عمر میں مَیں رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں اور اُن کے کردار سے واقف ہو چکا تھا۔ اب رامائن کتنی بڑی کتاب ہے۔ اس میں کتنے خوبصورت اور ایثار والے کردار آتے ہیں، لیکن اس کی کیا وجہ کہ اب رامائن کے کرداروں میں مجھے سب سے زیادہ ہمدردی سگریو کے ساتھ ہوئی جس کا بڑا بھائی بالی، اس کی بیوی تک کو اُٹھا کر لے جاتا ہے اور وہ بیچارہ منہ اُٹھا کر دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر بھگوان رام اُدھر نہ آ نکلتے تو سگریو بے چارہ لنڈورا ہی رہ گیا تھا۔ اسی طرح میری دلچسپی کا مرکز، ایک کردار مہابھارت میں بھی آتا ہے۔۔۔ شکھنڈی،

مخنّث۔۔۔ جسے بیچ میں رکھ کر بھیشم پتامہ کو مارا جاتا ہے، ورنہ وہ نہ مرتے۔۔۔ آج تک زندہ ہوتے۔

ماں کی بیماری کی وجہ سے میرے پِتا بازار سے ایک پیسے روز کے کرایے پر کوئی نہ کوئی کتاب لے آیا کرتے تھے اور میری ماں کے پاس بیٹھ کر اسے سنایا کرتے۔ میں پائنتی میں دُبکا سنا کرتا۔ گویا اسکول کی عمر کے ساتھ ٹاڈ کے راجستھان اور شرلک ہومز کے کارناموں سے واقف ہو چکا تھا۔ جو چیز اپنی سمجھ میں نہ آئی وہ تھی۔۔۔ مسٹریز آف دی کورٹ آف پیرس۔۔۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ اسے بڑے مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ اور میں حیران ہوتا تھا کہ فلاں آدمی کیوں ہر بار نئ عورت سے گڑبڑ کرتا ہے۔ جب تک میں جان چکا تھا کہ عورتوں کے پیچھے پڑنا کوئی شرافت کی بات نہیں اور یہ کہ عورت بہت گندی چیز ہے۔۔۔ چنانچہ میں بے کیف ہو کر سو جاتا۔

اس کے بعد میرے چچا نے ایک اسٹیم پریس خرید لیا جو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لایا۔ پرائمری سے مڈل تک پہنچتے پہنچتے میں نے وہ سب چَٹ کر لیں۔ میں وہ سلور فش تھا جو ہر پرانی کتاب کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔ یا بُک مارک، جسے ہر

معقول پبلشر نئی کتاب میں ڈال دیتا ہے۔ علمی طور پر میں قریب قریب ہر چیز سے واقف ہو چکا تھا لیکن عملی طور پر نہیں۔ علم اور عمل میں فاصلہ ہونے سے جو بھی تباہی ہو سکتی ہے، وہ ہوئی۔ میں ہر تجربے کی سُولی پر مصلوب ہوا اور شاید میرے لیے ضروری بھی تھا۔۔۔

زندگی کی ایسی بنیاد کو وضاحت سے بتا دینے کے بعد باقی کے حوادث کا ذکر فروعی ہے۔ یہی نا کہ میٹرک پاس کیا، کالج میں داخل ہوئے۔ انگریزی اور پنجابی میں شعر کہے۔ اُردُو میں افسانے لکھے۔ ماں چل بسیں۔ ڈاک خانے میں نوکر ہو گئے۔۔۔ شادی ہوئی، بچّہ ہوا۔ پِتا چل بسے۔ بچّہ چل بسا۔ نو سال ڈاک خانے میں ملازمت کی۔ ریڈیو میں چلے گئے۔۔۔ بٹوارہ ہوا۔۔۔ قتل و غارت۔۔۔ لہو سے لتھڑے ہوئے بدن۔۔۔ ننگے ریل کی چھت پر دلّی پہنچنا۔۔۔ اسٹیشن ڈائریکٹر جموں ریڈیو اسٹیشن۔۔۔ ریاست کے جمہوری نظام سے لڑائی۔۔۔ پھر بمبئی۔۔۔ اچھی فلمیں، بڑی فلمیں۔۔۔ کہیں کہیں بیچ میں افسانوں کی کوئی کتاب۔۔۔ پھر ہاتھ قلم کرتے رہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایتِ خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر کوئی معاشقہ۔۔۔ ایسے لمحے جو بُدھ پر بھی نہ آئے، ایسے پل جنہیں راجا مل بھی نہ جی سکا۔۔۔ بیوی میں دلچسپی کا فقدان، بیوی کی اپنے ساتھ محبّت کا خاتمہ۔۔۔ وجہ۔۔۔ ادھیڑ عمر کا سڑی پن۔ بڑے بیٹے کا مجھے کاروباری طور پر بیوقوف سمجھنا اور میرا اسے پیسے کا پجاری اور غیر ذمّہ دار۔۔۔ بھلا کوئی بات ہوئی؟

میرے اعتقادات کیا ہیں؟ کوئی نہیں۔ میری اُمّیدیں کیا ہیں، اور مایوسیاں کیا۔۔۔؟ کوئی نہیں۔ میں عقلمندی کی وجہ سے کسی عورت سے محبّت نہیں کرتا اور وہ بیوقوفی کی وجہ سے مجھ سے نہیں کرتی۔ اس لیے کہ میں حرص اور محبّت کا فرق سمجھتا ہوں۔ بغیر خواہش کے میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں لکھوں۔ پیسے کے لیے نہیں، کسی پبلشر کے لیے نہیں۔ میں بس لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی دھرم گرنتھ کی ضرورت نہیں کیونکہ اُن متروک کتابوں سے اچھی میں خود لکھ سکتا ہوں۔ مجھے کسی گرو، استاد، کسی دیکشا کی تلاش نہیں، کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا گرو ہو سکتا ہے، اور آپ ہی چیلا۔ باقی دکانیں ہیں۔ میں نے ہرے ہرے پتّوں

اور چنبیلی کے پھولوں سے باتیں کی ہیں اور ان سے جواب لیا ہے۔ میں کاگ بھاشا جانتا ہوں۔ میرا کتّا مجھے سمجھتا ہے اور میں اسے۔ مجھے کسی حقیقت، کسی موکش کی ضرورت نہیں۔ اگر بھگوان انسان کو بنانے کی حماقت کرتا ہے، تو میں انسان ہو کر بھگوان بناتے رہنے کی بیوقوفی کیوں کروں؟ اگر حقیقت کو میری ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں، وہ ماضی اور مستقبل سے بے نیاز، مکمل سکوت کے کسی لمحے میں مجھے اپنے آپ ڈھونڈ لے گی۔ میں ایک سادے سے انسان کی طرح جینا چاہتا ہوں، چاہنے کا مفہوم نکال کر۔ ایک ایسے مقام پر پہنچنے کی تمنّا رکھتا ہوں، تمنا سے عاری ہو کر، جسے ہم عرفِ عام میں 'سہج اوستھا' کہتے ہیں اور جو صرف جاننے کے بعد ہی آتی ہے، اور۔۔۔

۔۔۔میں نہیں جانتا!